بسم الله الرحمن الرحيم

دعائے امام زمانہؑ

اَللّٰھُمَّ کُنْ لِوَلِیِّکَ الْحُجَّۃِ بْنِ الْحَسَنِ

صَلَوَاتُکَ عَلَیْہِ وَعَلٰی آبَائِہٖ فِیْ ھٰذِہِ السَّاعَۃِ

وَفِیْ کُلِّ سَاعَۃٍ وَلِیّاً وَحَافِظًا وَقَائِدًا وَنَاصِرًا وَ

دَلِیْلاً وَعَیْنًا حَتّٰی تُسْکِنَہٗ اَرْضَکَ طَوْعًا وَ

تُمَتِّعَہٗ فِیْھَا طَوِیْلاً

عقائدِ اسلامی

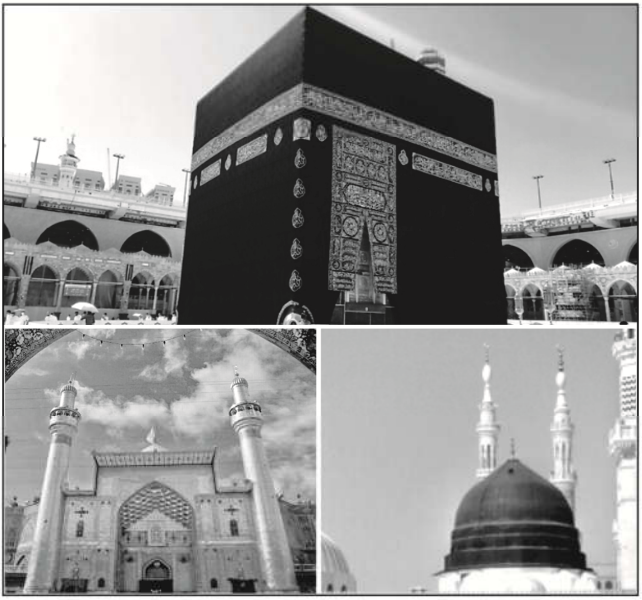

از کتاب: مکتبِ رسولؐ۔ اُستاد محسن قرائتی

المہدی ادارہ تربیت اسلامی
آئی ایس او پاکستان

المہدی (عج) ادارۂ تربیت اسلامی آئی ایس او پاکستان

فہرست

توحید

جہان بینی کے معنی ۹

جہاں بینی پر بحث کا فائدہ ۹

الٰہی جہاں بینی کا پہلا اصول (توحید) ۱۰

فطرت کیا ہے؟ ۱۱

نبیوں کا کام ۱۲

کیا اطاعت کا حکم انسانوں کی آزادی کے منافی ہے؟ ۱۳

عقیدہ، توحید، اُمید و ذمہ داری ۱۳

کون سا ایمان قابل قدر ہے؟ ۱۴

ایک جماعت خدا یا مذہب کی طرف رغبت کیوں نہیں رکھتی؟ ۱۴

دین کی ضرورت ۱۶

توحید کی اصلیت اور اس کے مختلف پہلو ۱۷

توحید سے روگردانی کے اسباب ۱۹

توحید کی دلیلیں ۲۰

۱) موجودات کی ہم آہنگی ۲۰

کسی دوسرے خدا کا خود کو ظاہر نہ کرنا ۲۱

شرک ۲۱
شرک کے نمونے ۲۲
شرک کا اجتماعی اثر ۲۳
آخرت پر شرک کا اثر ۲۴
ریا کار مشرک ہے ۲۴

عدل

ظلم کے اسباب ۲۶
خدا کی صفات سے ہماری واقفیت کا طریقہ ۲۸
ہم عدل کو اصولِ دین میں کیوں شمار کرتے ہیں ۲۸
عدل پر اشکالات کے جوابات
سماجی انصاف کا الٰہی جہاں بینی سے تعلق ۳۴
کافروں اور دشمنوں سے متعلق انصاف ۳۸
خوں بہا اور قصاص سماجی انصاف کے ضامن ہیں ۳۹
عدالت کی حفاظت کرنیوالے پیغمبر، امام اور فقیہ ۴۰

نبوّت

علم اور عقل کی ضرورت ۴۲
سائنس کی محدودیت و انبیاء کے دائرہ کار کی وسعت ۴۵
ہم لوگوں سے قانون کیسے منوائیں؟ ۴۹
قانون کو جاری کرنے کا ضامن کون ہے؟ ۵۲

۱۔فکری پختگی ۵۲
۲۔جذبات سے کام لینا ۵۳
۳۔خدااور قیامت پر ایمان ۵۴
۴۔نیکی کا حکم دینااور برائی سے روکنا ۵۴
۵۔حکومت اور سزا ۵۴
نبیوں کی پہچان ۵۵
معجزہ تماشا نہیں ہے ۵۶
معجزے کی اصلیت ۵۷
قرآن کی خصوصیات ۵۸
قرآن کی حقیقت ۶۰
تلاوتِ قرآن کے آداب ۶۳
انبیاءؑ کی پہچان کا دوسرا طریقہ ۶۴
تیسرا طریقہ ۶۵
پیغمبروں کی صفات ۶۶
اخلاص ۶۷
عصمت ۶۸
انبیاءؑ کی کچھ خصوصیات ۷۰
نبیوں کے دشمن ۷۳
لوگ انبیاءؑ کی مخالفت کیوں کرتے تھے؟ ۷۴

تکبّر اور بہانہ ۷۵
بے جا مطالبات کی وجہ سے انکار ۷۶
عیش پرستی کی وجہ سے انکار ۷۶

امامت

امامت اصولِ دین میں شامل ہے ۷۷
توحید سے امامت کا تعلق ۷۹
امام کی ضرورت ۸۰
امامت اور رہبری کا مقصد ۸۲
امام کی علامات اور صفات ۸۳
رہبر اور امام کے تقرر کا طریقہ ۹۷
امام کا تقرر صرف خدا کی طرف سے ہوتا ہے ۹۹
نامزدگی ہی صحیح راستہ ہے ۱۰۱
معصوموں کی امامت کیسے کمزور پڑ گئی ۱۰۳
آئمہؑ کے ساتھ زیادتیاں ۱۰۴

معاد

فطری دلیلیں ۱۰۷
مردوں کا زندہ ہونا ناممکن نہیں ۱۰۹
قرآن کا ایک یادگار واقعہ ۱۱۰
معاد کے ممکن ہونے میں دوسری مثالیں ۱۱۱

معاد کی پہلی دلیل: خدا کا عدل ۱۱۴
دنیا میں بدلے کی مثالیں ۱۱۷
عدلِ الٰہی کے متعلق آیات ۱۱۹
دوبارہ زندہ ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ۱۲۰
دوسری دلیل: خدا کی حکمت ۱۲۲
موت اور معاد کی یاد کے اثرات ۱۲۵
معاد سے انکار کے محرکات ۱۲۶
۱۔ ذمہ داری سے فرار ۱۲۶
۲۔ خدا کی قدرت اور علم پر ایمان کا نہ ہونا ۱۲۶

توحید

جہان بینی کے معنی

ہم سب نے ''جہان بینی'' کا لفظ سنا ہوا ہے، جہاں بینی یعنی زندگی کی مکمل تفسیر۔

کچھ لوگ جو اس کائنات کو دیکھتے ہیں وہ اسے ایسی با مقصد تخلیق پاتے ہیں جو شعور کی کار فرمائی سے وجود میں آئی ہے، ایک بنیاد پر قائم ہے اور تنظیم اور حساب رکھتی ہے۔ اسے ''الٰہی جہاں بینی'' کہتے ہیں۔

کچھ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ موجودات کی دنیا کا نہ پہلے سے تیار کیا ہوا کوئی منصوبہ ہے اور نہ ہی اس کا کوئی مدبر ہے۔ نہ اس کا کوئی مقصد ہے اور نہ حساب۔ اس نقطۂ نظر اور طرزِ خیال کو ''مادی جہاں بینی'' کہتے ہیں۔

غرض دنیائے موجودات اور خود اپنے متعلق انسان کا مکمل نقطۂ نظر اور تفسیر جہاں بینی ہے۔

جہاں بینی پر بحث کا فائدہ

ان دونوں نظریات کے فائدے اور نتیجے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر میں یہ سوچوں کہ اس بڑے گھر (کائنات) کا کوئی مالک، کوئی حساب اور کوئی مقصد ہے تو مجھ پر یہ لازم ہے کہ اپنے آپ کو گھر کے مالک (خدا) کی رضا جوئی کے لیے اس طریقے کے مطابق ڈھالوں جو اس نے وحی اور پیغمبروں کے واسطے سے انسان کے لیے مقرر کر دیا ہے اور اگر یہ کائنات کسی منصوبہ بندی، مقصد اور حساب کے بغیر ہی وجود میں آئی ہے تو پھر میرے لیے بھی کسی قاعدے اور ضابطے

کی پابندی قبول کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

بہترین نظریے اور جہان بینی کی پہچان ان چند باتوں سے ہوتی ہے۔

۱) وہ جہاں بینی عقل، دلیل اور ثبوت سے تعلق رکھتی ہو۔

۲) وہ نقطۂ نظر اور تشریح جو ہماری فطرت سے ہم آہنگ ہو۔

۳) وہ جہاں بینی قابلِ قدر ہے جو انسان کو ذمہ داری، خوشی اور اُمید سے ہمکنار کرتی ہے۔

اب ہم مندرجہ بالا علامات کے لحاظ سے اس پر غور کرتے ہیں:

الٰہی جہاں بینی کا پہلا اصول

توحید

عقل ہمیں بتاتی ہے کہ ہر نتیجے کا ایک سبب ہوتا ہے اور یہ بات اس قدر روشن ہے کہ اگر آپ کسی نومولود کے بدن پر ایک ہلکی سی پھونک ماریں تو وہ اپنی آنکھیں کھول دیتا ہے اور سبب کے پیچھے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتا ہے اور سمجھ جاتا ہے کہ اس پھونک کا کوئی سبب ضرور ہے۔ جی ہاں! نتیجے سے سبب کے سراغ لگانے کا مسئلہ ہماری روز مرّہ زندگی کے واضح ترین مسئلوں میں سے ہے۔ تمام عدالتوں میں جج اور وکیل علامتوں اور قرینوں ہی سے اصل مطلب تک پہنچتے ہیں مثلاً یہ بات کیسے مان لی جائے کہ مرغے یا مور کی تصویر کسی فوٹو گرافر یا مصوّر کی محتاج ہو مگر خود مرغا یا مور کسی تدبیر اور مدبّر کے بغیر ہی پیدا ہو گیا ہو۔ عقل کو کیسے مطمئن کریں کہ کیمرے کا تو کوئی موجد ہے لیکن انسانی آنکھ کا کوئی باشعور خالق نہیں ہے حالانکہ آنکھ کی فوٹو گرافی کیمرے کی فوٹو گرافی سے کہیں زیادہ مشکل ہے کیونکہ کیمرہ جتنی بار فوٹو لیتا ہے ہم اس کی فلم بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن ہماری آنکھ برابر فوٹو لیتی رہتی ہے اور ہم اس کی فلم بھی نہیں بدلتے۔ کیمرے عام طور پر سادہ فوٹو لیتے ہیں یا رنگین لیکن ہماری آنکھ سادہ فوٹو بھی لیتی ہے اور رنگین بھی، پاس سے بھی اور دور سے بھی، دھوپ میں بھی اور سائے میں بھی۔ پھر عقل کیسے مان لے کہ آئل ریفائنری کا تو بنانے والا ہو لیکن نظامِ

ہضم کا کوئی مدبر نہ ہو اور ہم کیسے تسلیم کر لیں کہ انسانی جسم کا نظام تو انسان میں شعور کی موجودگی کی دلیل ہو لیکن کائنات کا نظام اس میں ایک باشعور منظم کی موجودگی کی دلیل نہ ہو۔کائنات کے اندھے بہرے عناصر نے اپنے اندر کس طرح ایسے قوانین جاری کر لیے ہیں کہ ان میں سے محض کسی ایک قانون کی دریافت میں ایک محقق اپنی پوری عمر صرف کر دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ اگر جہاں بینی کا اصول یہ ہے کہ اسے عقل مان لے تو اس کائنات کا باریک حساب اور انتظام دیکھتے ہوئے پہلی ہی نظر میں عقل اس کے لیے ایک باشعور ہستی کو مان لیتی ہے (اور اسی عقل کی مدد سے انشاءاللہ اس بارے میں تمام شکوک وشبہات کا جواب بھی دیا جائیگا)

الٰہی جہاں بینی کی درستی کی دوسری علامت فطرت سے مطابقت ہے۔اس مقام پر فطرت کی تشریح کرنا ضروری ہے تا کہ جب ہم یہ کہیں کہ خدا شناسی ایک فطری امر ہے تو ہم اس آگاہی سے مستفید ہو سکیں۔

فطرت کیا ہے؟

''فطرت'' کا لفظ ''خلقت'' کے وزن پر ہے اور اس کے معنی بھی دیتا ہے۔انسان میں ہر قسم کا وہ جذبہ جس کے اُبھرنے میں تربیت، تلقین، استاد اور مربی کی ضرورت نہیں پڑتی اور وہ جذبہ انسان میں دائمی اور مستقل ہے اور سب لوگوں میں تمام مقاموں اور وقتوں میں برقرار رہتا ہے اسے کبھی فطرت اور کبھی جبلت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مثلاً بیٹے سے ماں کی محبت فطری ہے یعنی یہ ماں کا ایسا جذبہ ہے جو معلم، مربی اور کسی تلقین کے بغیر ماں کی خلقت میں چھپا ہوا ہے اور عمومیت رکھتا ہے۔آپ جہاں جائیں گے ہر وقت، ہر جگہ، ہر حکومت اور ہر نظام میں ماؤں میں مامتا ضرور پائیں گے البتہ یہ ممکن ہے کہ کبھی کچھ عناصر اس جذبے میں کمی یا بیشی کا سبب بن جائیں۔یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی کوئی ایک داخلی جذبہ دوسرے جذبے پر غالب آجائے۔

کسی بات کے فطری ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان ہمیشہ اس کے مطابق عمل کرتا ہے کیونکہ کبھی ایک فطری تقاضا دوسرے فطری احساس کو دبا دیتا ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ خدا شناسی بھی ایک فطری جذبہ ہے یا نہیں؟

ہم ہر وقت، ہر جگہ اور ہر مسلک کے ہر انسان سے پوچھتے ہیں کہ اس کائنات کے بارے میں آپ کے احساسات کیا ہیں؟ کیا آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ خود کفیل ہیں یا اپنے اندر محتاجی کا احساس رکھتے ہیں؟ کوئی نہیں ہے جو یہ کہے کہ میں اس دنیا میں اپنے آپ کو خود کفیل محسوس کرتا ہوں۔سب کے سب اپنے اندر محتاجی کا احساس رکھتے ہیں لیکن یہ سچا احساس دو طرح سے تسکین پاتا ہے:

۱) سچا احساس سچی تسکین کے ساتھ ۲) سچا احساس جھوٹی تسکین کے ساتھ

اس بچے کی مثال لیجئے جو بھوک کا احساس کرتا ہے۔یہ سچا احساس ہے جو کبھی ماں کا آنچل دبا کر سچ مچ کی تسکین پاتا ہے اور کبھی یہ احساس سوکھی چوسنی چوس کر جھوٹ موٹ کی تسکین پاتا ہے۔انسان میں محتاجی کا احساس ایک واقعہ اور ایک حقیقت ہے لیکن محتاجی کس کی؟

۱) خدائی قوت کی؟

۲) فطری قوت کی؟

خود فطرت بھی سینکڑوں شرائط کی پابند ہے اس لیے ہمیں ایسی قوت کا محتاج ہونا چاہیے جو ہماری طرح کسی اور کی محتاج نہ ہو۔

نبیوں کا کام

نبیوں کا کام یہ ہے کہ انسان کے لطیف جذبات کی جھوٹی تسکین نہ ہونے دیں۔اس ضمن میں ماں کے عمل اور سرپرستی کی مثال ہمارے سامنے ہے، جو بچے کو بھوک کی حالت میں ہر قسم کی غذا نہیں کھانے دیتی۔

کیا اطاعت کا حکم انسانوں کی آزادی کے منافی ہے؟

کبھی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاءؑ اور آسمانی مذاہب ہم کو خدا کی عبادت کرنے کی طرف بلاتے ہیں تو یہ بات انسان کی آزادی کے منافی ہے لیکن غور کیجیے کہ انسان کچھ اس طرح پیدا کیا گیا ہے کہ وہ عشق، عبادت، میل جول اور اُمید کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کی سرشت میں محبت اور عبادت کا جذبہ رکھ دیا گیا ہے چنانچہ اگر نبیوں کی رہبری میں اس جذبے کی تہذیب نہیں ہوئی تو وہ بتوں، ستاروں، انسانوں اور طاغوتوں کو پوج بیٹھتا ہے اس لیے خدا کی یہ عبادت اور بندگی انسانی آزادی کے منافی نہیں بلکہ یہ اس جذبے کی ایک سچی تسکین ہے جو جھوٹی تسکین کو روکتی ہے اور عشق و محبت کے راستے میں کجی نہیں آنے دیتی۔

عقیدہ، توحید، اُمید و ذمہ داری

جہاں بینی کے بہترین نظریے کی تیسری علامت یہ ہے کہ وہ انسان کو اُمید، عشق اور ذمہ داری عطا کرتی ہے۔ اگر کسی مدرسے کا ایک طالب علم یہ جان لے کہ اس کی محنتیں بیکار نہیں جائیں گی اور اس کے حاصل کردہ نمبر کا سواں حصہ تک شمار میں آئے گا اور اس کے معقول عذر قبول کیے جائیں گے تو وہ خصوصی لگن کے ساتھ تحصیل علم جاری رکھے گا۔ الٰہی جہاں بینی میں انسان یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ ہر وقت خدا کی نگرانی میں ہے۔ اس کا عذر قابل قبول ہے اور اس کی ذرّہ بھر نیکی یا بدی سے بے توجہی نہیں برتی جارہی۔ نیک کام کا خریدار خدا ہے اور اس کے جان و مال کا عوض بہشت اور رضوان ہے۔ ایک طرف غیبی سہارے اور دوسری طرف شک و شبہ، بھول چوک اور غلطی سے پاک الٰہی جہان بینی کا یہ مکتب، انسان کے دل میں اُمید کے چراغ جلا سکتا ہے۔

ہم قرآن میں پڑھتے ہیں:

پھر جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو نہایت خلوص سے اس کی عبادت کرنے والے بن کر خدا سے دعا کرتے ہیں، پھر جب وہ انہیں خشکی میں (پہنچا کر) نجات دیتا

ہے تو فوراً شرک کرنے لگتے ہیں۔(سورۂ عنکبوت۔آیت ۶۵)

کون سا ایمان قابلِ قدر ہے؟

قرآن کی رُو سے صرف وہ ایمان قابلِ قدر ہے جس کی بنیاد عقل اور صحیح سوچ بچار پر ہوتی ہے۔ہم قرآن میں پڑھتے ہیں:

اور (وہ لوگ جو) آسمانوں اور زمین کی بناوٹ پر غور کرتے ہیں اور (بے ساختہ) کہہ اُٹھتے ہیں کہ اے ہمارے خدا! تُو نے انہیں بے فائدہ پیدا نہیں کیا ہے۔''

(سورۂ آلِ عمران۔آیت ۱۹۱)

1۔ ایک جماعت خدا یا مذہب کی طرف رغبت کیوں نہیں رکھتی؟

اس کا جواب یہ ہے:

۱) اگر ہم یہ کہیں کہ انسان ایک خلیے کی بناوٹ یا ایٹم کے ذرّے سے خدا کو پہچان سکتا ہے تو یہ صرف ان لوگوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے جو اسے پہچاننا چاہتے ہوں لیکن جو پہچاننے کی نیت ہی نہ رکھتا ہو وہ آثار سے خدا کو ہرگز نہیں پہچانے گا۔

ایک آئینہ فروش پر غور کیجئے کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور صبح سے شام تک وہ سینکڑوں دفعہ آئینوں کو دیکھتا ہے لیکن اپنے بال نہیں سنوارتا کیونکہ اسے اپنی درستی کا خیال نہیں ہے۔وہ آئینے بیچنے کی فکر میں ہے اپنے بال درست کرنے کی فکر میں نہیں۔

کبھی انسان رومال سے گھڑی کا شیشہ صاف کرتا ہے تو ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ ظہر کی نماز کے لیے کتنا وقت باقی ہے؟ وہ دوبارہ گھڑی دیکھتا ہے کیونکہ ابھی تک وہ اسے صاف کرنے کی فکر میں تھا وقت دیکھنے کی فکر میں نہیں۔

انسان جب تک پہچاننا یا استفادہ کرنا نہیں چاہتا تو نہ کسی چیز کو پہچانتا ہے نہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔اسی طرح لوگ خدا کے آثار دیکھتے ہیں اور غور کرتے ہیں لیکن اس سے ان کا مقصد خدا کی پہچان نہیں ہوتا۔

آپ جانتے ہیں کہ اگر ایک نعمت شروع ہی سے ہمیں حاصل رہے تو ہمارے لیے اس میں کوئی تازگی باقی نہیں رہتی۔ اب جو ہم خدا کے آثار دیکھتے ہیں تو اسے یاد نہیں کرتے اور اس کی قدر نہیں پہچانتے کیونکہ زندگی کے شروع ہی سے ہم نعمتوں میں اور نعمتوں کے ساتھ رہے ہیں۔

مثال یہ ہے:

آپ نے اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کے لیے خدا کا شکر کبھی ادا نہیں کیا کیونکہ وہ پیدائش سے آپ کے ساتھ چلا آرہا ہے لیکن فرض کیجئے کہ یہ انگوٹھا تھوڑے دنوں کے لیے بند ھ جائے یا بالکل کٹ جائے تو آپ دیکھیں گے کہ آپ اس کے بغیر گریبان کا بٹن تک نہیں بند کر سکتے۔

جو لوگ مذہب سے منحرف ہیں اس کا سبب وہ بے سر و پا باتیں ہیں جو نادان دوستوں اور دانا دشمنوں کی طرف سے مذہب میں بڑھا دی گئی ہیں۔ مثلاً:

اگر ہم پیاسے انسان کو جو پانی مانگ رہا ہے ایک گلاس پانی دیں اور اس گلاس میں مکھی گر جائے تو وہ پانی نہیں پیتا اسے گرا دیتا ہے چنانچہ جس طرح انسان ایک مکھی کی وجہ سے پانی کو نظر انداز کر دیتا ہے اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ چند بے اصل باتوں کی موجودگی کے باعث وہ اصل مذہب کو ہی نظر انداز کر دے۔

2۔ ماحول کا اثر

مذہب اور مذہبی احکام سے انسان کے انحراف کی ایک وجہ وہ مسئلہ ہے جسے ماحول کا اثر کہتے ہیں۔ انسان اپنی فطرت اور ضمیر کی رو سے چوری کو ناپسند کرتا ہے، خیانت کو برا جانتا ہے لیکن جب ایسے ماحول میں جا رہتا ہے جس میں لوگ چوری اور خیانت کرنے والے ہوتے ہیں تو اسے بھی ان طور طریقوں کی عادت پڑ جاتی ہے۔

3۔ ذمہ داری سے بچنا

کبھی مذہب سے بے اعتنائی ذمہ داری سے بچنے کی خاطر ہوتی ہے کیونکہ مذہب کا قبول کرنا مکمل قید اور پابندیاں قبول کرنے کے برابر ہوتا ہے۔ ایک جماعت صرف اس لیے کہ اپنے خیال

میں آزاد رہے مذہب سے بے پروا ہو جاتی ہے لیکن وہ اس بات سے غافل ہے کہ خدا کی اطاعت اور حکم سے آزاد ہونے کے لئے ہر قسم کی قید اور غلامی قبول کرنا پڑتی ہے جو اس (خدا) کا غلام نہیں رہا وہ سب کا غلام بن جائے گا۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات
علامہ اقبالؔ

4۔ دشمنی

ایک جماعت تعصب، ہوس اور خودغرضی کی وجہ سے ضد اور مخالفت کرتی ہے اور خدائی مکتب کو مسترد کر دیتی ہے۔

صحیح تبلیغ کے نہ ہونے اور تبلیغ کی کوتاہیوں یا غلط پیشکش کو بھی ان بے پروائیوں کا ایک سبب سمجھا جا سکتا ہے۔

دین کی ضرورت

انسان زندگی میں کسی لائحہ عمل کے بغیر نہیں رہتا لیکن وہ زندگی کا یہ نقشہ اور اپنی کامیابی اور ترقی کس طرح حاصل کرے؟ اس مقام پر اس کے سامنے تین طریقے ہیں:

۱) اپنے سلیقے اور رجحان کے مطابق دستورِ حیات کا انتخاب کرے۔
۲) لوگوں کی خواہشوں کے مطابق اپنا دستورِ حیات مرتب کرے۔
۳) اپنے آپ کو خدا کا اطاعت گزار بنائے اور صرف اسی سے اپنا دستورِ حیات حاصل کرے۔

پہلا طریقہ

یہ طریقہ غلط ہے کیونکہ انسانی سمجھ محدود ہے اور وہ خود اپنے گزشتہ اعمال کے متعلق

سینکڑوں غلطیوں اور لغزشوں کا گواہ ہے۔جبلتوں کا طوفان ہر گھڑی انسان کو برائی کی طرف لے جاتا ہے۔

دوسرا طریقہ

یہ طریقہ بھی پہلے طریقے سے کچھ کم غیر تسلی بخش نہیں ہے اس لیے کہ دوسرے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے اور وہ طرح طرح کی خواہشات اور میلانات رکھتے ہیں۔اس کے علاوہ وہی لغزشیں، بھول اور کوتاہی جو اپنے سلیقے میں ہے ان کے نظریے میں بھی ہے۔

تیسرا طریقہ

صرف یہ طریقہ صحیح ہے کیونکہ جس طرح ہم اپنی گاڑی مکینک کے سپرد اور جسم معالج کے سپرد کر دیتے ہیں اس لیے کہ وہ ہم سے زیادہ جاننے والا ہے۔اسی طرح ہمیں چاہیے کہ ہم اپنا دستورِ حیات خدا کے سپرد کر دیں کیونکہ وہ ہم سے زیادہ جاننے والا ہے۔

توحید کی اصلیت اور اس کے مختلف پہلو

توحید یعنی صرف خدا کو مَلِک الناس (لوگوں کا بادشاہ) سمجھنا، خدا کے ایک ہونے پر ایمان رکھنا اور خدا کو لاشریک اور بے ہمتا جاننا۔

توحید یعنی خواہشات کی نفی۔جو ہوس پرست ہے وہ توحید کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے:

''تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔''

(سورۂ جاثیہ۔آیت ۲۳)

توحید یعنی طاغوتوں کی نفی۔امام رضا علیہ السلام نے مامون کی ولی عہدی کو مجبوراً قبول کرنے کے بعد ایک مجمع عام میں سب لوگوں کے سامنے یہ شرط لگائی کہ آپؑ مامون کے اس نظام میں موقوفی اور تقرری کے امور میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔

توحید یعنی تمام مشرقی اور مغربی اور ان کو ملانے والے خطوط کو کاٹ دینا اور تمام نظریوں اور نظاموں کو رد کر دینا جو عام طور پر خود غرض لوگوں کے ذہنوں کی امیج ہیں۔

توحید یعنی ان تمام سلسلوں اور رشتوں کو توڑ دینا جو مسلمانوں پر دوسروں کی بالادستی اور تسلط کا سبب ہیں۔

توحید یعنی کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرنا جس کا حکم خدا کی حدود کے مطابق نہ ہو۔

توحید یعنی ایسے لوگوں کی رہبری قبول کرنا جن کی رہبری کو خدا نے پسند فرمایا ہے۔

توحید یعنی ایسے لوگوں کی رہبری قبول کرنا جن کی رہبری کو خدا نے پسند فرمایا ہے۔

توحید یعنی خدا کی بندگی اور اس کے احکام بجالانا۔

توحید کا خلاصہ یہ ہے کہ سب اندرونی اور بیرونی بت یعنی نام کا بت، سمجھ کا بت، منصب کا بت، مزاج کا بت اور مال کا بت توڑنا ان معنوں میں کہ ان میں سے کوئی بھی مجھے حق کے دائرے سے، حق کے ماننے سے اور حق کے راستے سے نہیں روک سکتا۔

توحید یہ ہے کہ حق سے تعلق کے سوا کوئی دوسرا تعلق میرے لیے راہ عمل معین نہیں کرسکتا بلکہ میرا اُٹھنا بیٹھنا خدا ہی کے لیے ہوگا۔

توحیدی اقتصادیات، یعنی ذرائع پیداوار، طریقۂ تقسیم اور حق استعمال کے لائحہ عمل میں خدا کا حکم ہی کارفرما ہو۔ توحیدی سپاہ یعنی مہارت اور لشکر کی روانگی، حملہ، جنگ، حکمت عملی اور قہر وغضب، ہر حال میں خدائی فریضے کا خیال رہے اور دل کے کسی گوشے میں رقابت، خودغرضی، انتقام، ملک گیری اور استحصال کا قصد شامل نہ ہو بلکہ حق بات کی اشاعت اور خدائی قانون کا نفاذ مدّنظر ہو۔ خدا کے حکم سے ظالم کی بیخ کنی، کمزوروں کی نجات اور ان کے مال، جان اور عزت کا بچاؤ اور سرحدوں کی حفاظت کی کوشش ملحوظ ہو۔

توحیدی معاشرہ یعنی ایسا معاشرہ جس کا رہبر زور وزر بردستی، قبیلہ یا پارٹی وغیرہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ خدائی اصولوں (علم، تقویٰ، جہاد، کارکردگی، امانت، قدرت اور انتظامی قابلیت وغیرہ) کے مطابق منتخب ہو۔ توحیدی معاشرہ یعنی جس معاشرے میں صرف ایک ہی مکتب اور وہ بھی خدائی مکتب حکمران ہو اور سب لوگوں پر اس کا حکم یکساں طور پر نافذ ہو اور قانون کی نظر میں سب برابر ہوں، جس میں ذاتی فائدے کی کوششیں باطل ہوں اور باہمی تفرقے مٹ جائیں۔ شاید توحید

کے یہ معنی جو بیان ہوئے مکمل، وسیع اور درست ہوں۔

توحید سے روگردانی کے اسباب

ان اسباب میں سے جو انسان کو خدا کے راستے اور توحید کے دائرے سے خارج کر دیتے ہیں کچھ یہ ہیں:

۱) **طاغوت اور زور زبردستی:** گمراہی کے اسباب میں سے ایک سبب لوگوں کا خوف ہے۔ قرآن، فرعون کی بات دہرتا ہے کہ وہ اعلان کرتا تھا:

''اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو اپنا معبود بنایا تو میں ضرور تمہیں اپنا قیدی بناؤں گا۔''

(سورۂ شعرا۔آیت ۱۹)

چنانچہ لوگ بھی ڈر کے مارے اس کی بندگی میں مشغول رہتے تھے۔

۲) **عشق و عقیدت:** کبھی کسی چیز سے عشق اور محبت اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ انسان خدا کو نظر انداز کر دے اور اس چیز یا انسان کی طرف رخ کرے جس سے اسے دلی تعلق ہے اور اس چیز کو اپنے کام، خوشی اور ناخوشی کا محور مانے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

''ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں، زاہدوں اور مریمؑ کے بیٹے مسیحؑ کو اپنا پروردگار بنا ڈالا۔'' (سورۂ توبہ۔آیت ۳)

یہ بنے ہوئے عالم خدا کے بتائے ہوئے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دیتے تھے اور یہ لوگ ان سے اپنی عقیدت کے باعث اسے مان لیتے تھے۔

۳) بے جا اُمید: کبھی لوگ مدد یا عزت حاصل ہونے کی اُمید میں غیر خدا پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے: ''اور لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر فرضی معبود بنا لیے ہیں تا کہ انہیں ان سے کچھ مدد ملے۔'' (سورہ یٰس۔آیت ۷۴)

اور دوسری آیت میں کہتا ہے: ''اور لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر دوسرے معبود بنا رکھے ہیں تا کہ وہ ان کی عزت کا باعث ہوں۔'' (سورۂ مریم۔آیت ۸۱)

توحید کی دلیلیں

۱) موجودات کی ہم آہنگی

توحید کی سب سے اچھی اور سب سے سادہ دلیل وہ تنظیم اور ہم آہنگی ہے جو موجودات کے درمیان پائی جاتی ہے۔

ایک عمارت کے مختلف حصوں، ایک کتاب کے مقالوں اور ایک خط کی سطروں میں ہم آہنگی اس بات کی بہترین دلیل ہے کہ انہیں بنانے والا اور لکھنے والا ایک ہی ہے۔ اگر تین مصور ایک گوشے میں ایک مرغے کی تصویر بنانے میں مشغول ہوں اور ان میں سے ایک مرغے کے سر کی، دوسرا پیٹ کی اور تیسرا اس کے پاؤں کی تصویر کھینچے اور اس کے بعد ہم ان تینوں اوراق کو تینوں مصوروں سے لے لیں اور آپس میں جوڑ دیں تو تینوں مصوروں کی بنائی ہوئی مرغے کے سر پیٹ اور پاؤں کی تصویریں ایک دوسری سے ہم آہنگ نہیں ہوں گی۔

انسان تنفس کے دوران جو کاربن گیس نکالتا ہے۔ نباتات کے ردعمل سے جو کاربن گیس لیتی اور آکسیجن نکالتی ہے کس طرح ہم آہنگ اور متناسب کام کرتا ہے! کیمرے کی بناوٹ روشن آنکھ سے کس طرح ہم آہنگ ہے اور آنکھ کی پتلی روشنی میں کس طرح خود بخود سکڑتی اور کم روشنی میں کس طرح پھیلتی ہے اور اگر زیادہ ضرورت ہوتی ہے تو پلکیں اور کالی کالی خوشنام بھوئیں روشنی کو متناسب کر کے کس طرح اس آلے تک پہنچا دیتی ہیں! آنکھ نمکین پانی سے اور منہ میٹھے پانی سے کس طرح تعلق رکھتا ہے۔

سورج روشنی نیچے پھینکتا ہے، بحر اوقیانوس بھاپ اوپر بھیجتا ہے، زمین کی کشش اسے پھر نیچے لے آتی ہے اور درختوں کی جڑیں غذائی مواد زمین سے اوپر دھکیلتی ہیں۔ کیا یہ ہم آہنگیاں ایک لامحدود اور مدبر قدرت کی کارفرمائی کا پتہ نہیں دیتیں؟

کسی دوسرے خدا کا خود کو ظاہر نہ کرنا

ایک بات کہ جس کی طرف امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے ہمیں متوجہ کیا ہے یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا خدا ہوتا تو وہ بھی اپنے پیغمبر بھیجتا اور ہمیں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا۔ علاوہ ازیں اگر دو خدا ہوں اور دونوں قدرت کے سرچشمے ہوں تو دونوں محدود ہوں گے اور محدود ہوں تو خدا نہیں ہیں کیونکہ محدود قدرت وہ قدرت ہے جو ایک مرحلے پر نابودی تک پہنچتی ہے اور ہم کو معلوم ہے کہ ایسی قدرت خدا نہیں ہوسکتی یا پھر دونوں لامحدود قدرتیں ہوں۔ اگر دونوں لامحدود ہوئے تو بھی دونوں قدرت نہیں ہیں۔ میں اس بارے میں ایک عالم کی بیان کردہ ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

اگر آپ نے ایک معمار سے کہا کہ وہ ایسا گھر بنا دے جس کا رقبہ لامحدود ہو تو ظاہر ہے کہ وہ ایک سے زیادہ گھر نہیں بنا سکتا کیونکہ دوسرے گھر کے لیے جگہ ہی نہیں بچے گی۔

شرک

شرک یعنی: غیر خدا پر بھروسا کرنا اور خدا کی مخلوق کو خدا کا مقام دینا۔ خدا کی قدرت کے مقابلے میں ایک اور قدرت قرار دینا۔

شرک یعنی: غیر خدا کی بے چون و چرا اطاعت کرنا۔

شرک یعنی: ہر طرح کا گروہی میلان اور ہر قسم کی پرستش، جو خدا کے لیے نہ ہو۔

قرآنی داستانوں میں زیادہ تر ان دو باتوں کا تذکرہ ملتا ہے:

۱۔ اللہ کی قدرت سے ایمان تازہ کرنا۔ غیبی امداد اور الطاف کا خیال، خدا کے قہر و غلبہ سے غافل نہ ہونا۔

۲۔ تمام مفروضہ سہاروں کو توڑ پھینکنا، تمام غلط معیاروں کو باطل قرار دینا اور شرک کی تمام

جڑوں کو کاٹ ڈالنا۔

ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بے ایمان بیٹے کو خبردار کیا اور بتایا کہ اس زمانے کے تمام کافر خدا کے غضب سے طوفان میں غرق ہو جائیں گے۔ بیٹے نے کہا جب تک آپ کے خدا کا قہر موجود رہے گا میں پہاڑ کی چوٹی پر پناہ لیے رہوں گا۔ دیکھا آپ نے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کنعان کی منطق کیا ہے۔ وہ پہاڑ اور پہاڑ کی قوت کو قہر خدا کا مدّ مقابل سمجھتا ہے۔ یہ شرک کی اصلیت کی مثال ہے اور اب اگر ہم بھی نوح علیہ السلام کے بیٹے کی طرح کسی انسان یا کسی چیز کو خدا کے مقابلے میں کھڑا کر دیں تو ہم بھی مشرک ہو جائیں گے۔

شرک کے نمونے

ایک شخص کہتا ہے کہ اب ہمیں نمازِ استسقاء کی ضرورت نہیں رہی۔ ہم جھیل یا ڈیم میں اپنی ضرورت کا پانی محفوظ کر لیں گے۔ دوسرا شخص کہتا ہے کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ خدا قہر نازل کرے اور لوگوں میں قحط پڑ جائے کیونکہ باہر سے گیہوں کے جہاز فوراً آ جاتے ہیں۔

تیسرا شخص کہتا ہے کہ شرعی قانون جو اہمیت رکھتا ہے اسے ہم مانتے ہیں لیکن ہم یہ نہیں کر سکتے کہ ملکی یا بین الاقوامی قوانین سے انحراف کریں یا یہ کہتا ہے کہ خدا کا حکم تو ایسا ہے لیکن مردوں یا عورتوں کی رضامندی کا بھی خیال کرنا چاہیے اس لیے ہم کبھی خدا کے حکم کی اور کبھی دوسروں کے حکم کی بھی پیروی کرتے ہیں۔ اس قسم کا نظریہ اور منطق توحید اور بندگی کے خلاف ہے۔ (۱)

---

۱) ایک فقیہ بیان کرتے تھے: تقریباً بیس سال پہلے میں آیت اللہ خمینیؒ کے ساتھ قُم سے تہران جا رہا تھا۔ اثنائے راہ میں، میں نے ان سے کہا یہ بہت اچھا ہے کہ عراقی حکومت ایرانیوں کو عراق میں داخلے کی اجازت نہیں دیتی ورنہ قم کے علماء اور طلباء نجف چلے جاتے اور قم کا حوزۂ علمیہ ویران ہو جاتا۔ آیت اللہ اس گفتگو سے بہت آرزدہ ہوئے اور راستے بھر مجھے سمجھاتے رہے کہ اگر کسی کے دل میں غیرِ خدا کا خیال ہے اور وہ سوچتا ہے اور چاہتا ہے کہ ایک اونچا اور دوسرا نیچا ہو جائے۔ یعنی قم کا حوزہ پُر رونق اور نجف کا حوزہ بے رونق ہو جائے یا اس کے برعکس تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کی راہ اور مرضی کے سوا کسی دوسرے معاملے کی درستی کی فکر میں رہیگا اور اس طرح وہ توحید کے دائرے سے نکل جائیگا۔ تعلقات، رشتے، علاقے، خانوادے، پیشے اور مقامی اور قبائلی تعصّبات کی بجائے ہمارا مرکزِ خیال خدا اور صرف خدا ہونا چاہیے۔

قرآن کہتا ہے:

''اکثر لوگوں کی یہ حالت ہے کہ وہ خدا پر ایمان نہیں لاتے مگر یہ کہ شرک بھی کیے جاتے ہیں۔'' (سورۂ یوسف۔ آیت ۱۰۶)

شرک کا اجتماعی اثر

توحیدی معاشرے میں ذاتی ذوق، قانون اور گروہی میلانات سب ایک ہی حلقے میں داخل ہیں۔ حکم، قانون اور راہ صرف ایک ہی ہے اور وہ خدا کی راہ اور خدا کا قانون ہے اور سب لوگوں کا ایک ہی سرپرست ہے لیکن شرک کے معاشرے میں ایک قانون اور ایک راہ کی بجائے سینکڑوں قانون اور راہیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ہر شخص اسی راہ اور اسی بات کی حمایت کی کوشش میں رہتا ہے جو اس نے اختیار کر رکھی ہے اور بقول قرآن:

''اس وقت ہر خدا اپنی اپنی مخلوق کو لیے پھرتا۔'' (سورۂ مومنین۔ آیت ۹۱)

یعنی اس معاشرے میں وکلاء حقیقت کی نہیں صرف اپنے اپنے مؤکلوں کی حمایت کرتے ہیں۔

اس معاشرے میں خدا کی عبادت مقصود نہیں ہوتی بلکہ دوسروں کی خوشامد پیش نظر ہوتی ہے۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کا کہنا مانا تو انہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔

(سورۂ احزاب۔ آیت ۶۷)

لوگ ہمیشہ ایک دوسرے سے رقابت رکھتے ہیں۔

بقول قرآن:

''یقیناً ایک، دوسرے پر چڑھائی کرتا۔'' (سورۂ مومنون۔ آیت ۹۱)

اور جو کچھ اس کے نزدیک پسندیدہ ہے ہر گروہ اسی سے اپنا دل خوش کرتا ہے اور حق و باطل سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ صرف اپنے مقصد، اپنی راہ، اپنے خیر خواہوں اور اپنے سماجی مقام کی حقیقت کا قائل ہوتا ہے لیکن اپنے مخالفوں کی (چاہے وہ مخالفت کے دلائل بھی رکھتے ہوں) قدر و

قیمت کا قائل نہیں ہوتا اور قرآن کے کہنے کے مطابق:

جس فرقے کے پاس جو دین ہے وہ اسی میں نہال ہے۔(سورۂ روم۔آیت ۳۲)

آخرت پر شرک کا اثر

رسوائی کے ساتھ دوزخ میں داخلہ شرک کے اخروی اثرات میں شامل ہے۔ہم قرآن مجید میں بار بار پڑھتے ہیں کہ قیامت میں مشرکوں سے خطاب ہوگا کہ تم دنیا میں غیر خدا کے پیچھے چلے تھے اور سوچتے تھے کہ وہ تمہارے دکھ کی دوا کریں گے۔آج تمہاری پکڑ کا دن ہے، اب انہیں بلاؤ کہ وہ تمہاری نجات کے لیے کوئی تدبیر سوچیں۔قرآن مزید کہتا ہے:

خدا کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بنانا ورنہ تمہیں نہایت رسوائی کے ساتھ جہنم کے بھڑکتے شعلوں میں جھونک دیا جائے گا۔(سورۂ بنی اسرائیل۔آیت ۳۸)

ریاکار مشرک ہے

ہم حدیث میں پڑھتے ہیں: ہر ریاکاری شرک ہے (كُلُّ رِياءٍ شِرْكٌ) البتہ شرک کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔یہ کبھی تو بالکل ظاہر اور عیاں ہوتا ہے جیسے بت، چاند سورج کو پوجنا اور کبھی اتنا خفیف ہوتا ہے کہ خود انسان بھی جو اس میں مبتلا ہوتا ہے اسے نہیں سمجھ پاتا۔ہم حدیث میں پڑھتے ہیں کہ یہ شرک اور اخلاص (توحید تنزیہی) کا مسئلہ اور اس کی پہچان اس قدر مشکل ہے جتنی آدھی رات کو پتھر پر چیونٹی کے چلنے کی پہچان، اس لیے اللہ کی دائمی مدد، غور و خوض اور جستجو کے بغیر شرک کے باریک جال سے نجات آسان کام نہیں ہے۔

مشرک قوم کی علامت

قرآن سورۂ زمر میں فرماتا ہے: جب صرف اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اس سے متنفر ہو جاتے ہیں اور جب خدا کے سوا (اور معبودوں کا) ذکر کیا جاتا ہے تو پھر ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔(آیت ۴۵) مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ خدا کے حکم کے مطابق اس روش یا شخص یا گروہ کا مقابلہ کرنا چاہیے، یہ خدائی فریضہ ہے تو کچھ چہرے بگڑ جاتے ہیں

لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں بین الاقوامی قانون کے مطابق۔۔۔۔تو وہی چہرے کھل اٹھتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کے شرک کی علامت ہے۔اگر ہم کہیں کہ ''خدا چاہتا ہے'' تو ناخوش ہو جاتے ہیں اور اگر ہم کہیں کہ لوگ ایسا چاہتے ہیں تو وہ خوش ہو جاتے ہیں تمام معاملات میں وحی کے بجائے ان لوگوں نے اپنی آنکھیں مشرق ومغرب کی طرف لگا رکھی ہیں۔خدا کی بجائے غیروں کی طرف توجہ اور اس کے قانون کی جگہ غیر کے قانون سے دلچسپی رکھتے ہیں۔یہ ایک قوم کی گمراہی کی علامت ہے۔

❁❁❁❁

عـــدل

ظلم کے اسباب

پہلے باب میں ہم نے مختصر طور پر الٰہی جہاں بینی اور توحید اور شرک کے بارے میں بحث کی تھی۔ اس باب میں ہم اپنے دوسرے اعتقادی اصول یعنی عدل پر گفتگو کرتے ہیں۔

ہم اس عقل کی قوت سے جو خدا نے ہمیں عنایت کی ہے اچھائیوں اور برائیوں کو پہچانتے ہیں اور اس بات کو سمجھتے ہیں کہ ظلم برا ہوتا ہے اور عدالت اچھی چیز ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ خدا کوئی برا کام نہیں کرتا اور اس کے پاس ظلم وستم نہیں ہے کیونکہ وہ تمام ظلم وستم جو ہم انسان میں دیکھتے ہیں وہ مندرجہ ذیل نقائص میں سے کسی ایک سے نکلتے ہیں:

۱۔ جہل

کبھی کبھی جہل اور نادانی ظلم کا سبب ہوتی ہے مثلاً انسان یہ بات نہیں جانتا کہ سفید اور سیاہ نسلوں میں باہم کوئی فرق نہیں ہے اس لیے ایک سفید رنگ رکھنے والا انسان اپنی برتری کے زعم میں کالی رنگ والے انسان پر ظلم کرتا ہے۔ اس ظلم کے جڑ ناواقفیت یا خودغرضی ہے اس لیے ممکن ہے کہ انسان اپنی غلط اندیشی، کج فہمی اور نادانی سے ایسے کام کرنے لگے جن کا نتیجہ سوائے ظلم کے کچھ نہ ہو لیکن وہ خدا جسے جہل سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جس کا علم لامحدود ہے کس طرح ممکن ہے کہ اس سے ظلم سرزد ہو؟

۲۔ خوف

کبھی ظلم کا محرک خوف ہوتا ہے مثلاً ایک قوت اپنی دشمن قوت سے گھبراتی اور ڈرتی ہے کہ اگر وہ اپنی مخالف قوت پر حملہ نہیں کرے گی تو اُدھر سے اس پر حملہ ہو جائے گا اس لیے وہ پیش قدمی کرتے ہوئے حملہ آور ہو کر اس پر ظلم کرتی ہے یا طاغوت اپنی طاقت کی بنیدیں مضبوط کرنے اور آزادی چاہنے والوں پر اپنا تسلّط قائم رکھنے کے لیے ظلم وستم کرتے ہیں لیکن کیا خدا کا بھی کوئی رقیب ہے یا اسے بھی اپنی وقت کا سکہ جمانے کی ضرورت ہے؟

۳۔ ضرورت اور کمی

کبھی ظلم کا سبب ضرورت ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ مادی یا نفسانی ضرورتیں کسی شخص کو مجبور کر دیں کہ وہ برے کام میں ہاتھ ڈالے اور دوسروں پر ظلم کرے۔

۴۔ ممکن ہے کہ بسا اوقات ظلم لوگوں کی باطنی کمینگی کی وجہ سے ہو۔ بعض افراد اذیت پسند ہوتے ہیں اور دوسروں کو ایذا پہنچانے میں یا دوسروں کے ایذا اٹھانے سے مزہ لیتے ہیں۔

اب جو آپ ظلم کے اسباب سے واقف ہو گئے ہیں تو بتایئے کہ آپ خدا میں کون سا سبب پاتے ہیں جس سے اس میں ظلم کی تحریک ہو؟ اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے:

''خدا موجودات عالم میں سے کسی پر ظلم کا ارادہ تک نہیں کرتا۔'' (سورہ آلِ عمران۔ ۱۰۸)

جو خدا ہمیں عدالت کا حکم دیتا ہے۔ (۱) کیونکر ممکن ہے کہ وہ خود ظلم کرے؟ کیسے ممکن ہے کہ خدا انسان کو جو کمزور ہے اور جو سرکش جبلتوں کے طوفان میں زندگی بسر کرتا ہے یہ حکم دے کہ جو دشمنیاں اور تکلیفیں اسے قوم سے ملتی ہیں وہ اسکی بے عدالتی کا سبب نہ بنیں۔ (۲) لیکن وہ خود لا محدود قوت کا مالک ہونے اور کسی جبلت کے زیرِ اثر نہ ہونے کے باوجود ظلم کرے؟

---

(۱) سورۂ نحل۔ آیت ۹۰

(۲) سورۂ مائدہ۔ آیت ۸

خدا کی صفات سے ہماری واقفیت کا طریقہ

خدا کی صفات سے ہماری واقفیت کا طریقہ خود خدا سے ہماری واقفیت کے طریقے سے ملتا جلتا ہے مثلاً جس طرح آپ کسی تحریر سے اس کے لکھنے والے کا سراغ پا لیتے ہیں، اسی طرح اسلوبِ تحریر سے بھی لکھنے والے کی معلومات کا پتا پا لیتے ہیں۔ اس کے الفاظ سے سمجھ جاتے ہیں کہ اسے الفاظ کے استعمال سے کتنی واقفیت ہے۔ اس کی انشا سے اس کے لکھنے کی قابلیت اور مقصدِ تحریر جان جاتے ہیں اور اس کی باتوں سے اس کی ذہنیت سے باخبر ہو جاتے ہیں غرض ہر پیدا ہونے والا دو کام کر سکتا ہے:

۱۔ اپنے خالق کی پہچان کرائے۔

۲۔ اپنے خالق کی صفات، حالات اور اس کے مقصدِ تخلیق کو واضح کرے۔ (۱)

ہم عدل کو اصولِ دین میں کیوں شمار کرتے ہیں

جب خدا بہت سی صفات مثلاً حکمت، قدرت، خالقیت اور علم وغیرہ رکھتا ہے تو پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ عدالت دین کا ایک اصول ہے؟

یہ کیوں نہیں کہتے کہ اول توحید دوم حیات۔

جواب: چونکہ مسلمانوں کا چھوٹا سا گروہ (فرقہ اَشعری) خدا کے عادل ہونے کو ضروری نہیں سمجھتا اور کہتا ہے کہ خدا نے جو کام چاہا وہی ٹھیک ہے چاہے ہماری عقل کی رو سے وہ کام خراب، غلط اور ظلم ہی ہو مثلاً اشاعرہ کہتے ہیں کہ اگر خدا امیر المومنین امام علی علیہ السلام کو دوزخ میں اور ان کے قاتل ابن ملجم (مردود) کو بہشت میں بھیج دے تو اس کے لیے کوئی امر مانع نہیں ہے لیکن

---

۱) بیشک خدا کی تمام صفات قدرت اور علم جیسی نہیں ہیں۔ خدا کی صفات دو طرح کی ہیں:

الف) وہ صفات جو اس سے الگ نہیں ہو سکتیں جیسے علم، قدرت اور حیات۔

ب) وہ صفات جو اس سے الگ ہو سکتی ہیں جیسے خالق ہونا کیونکہ یہ تو تصور کیا جا سکتا ہے کہ خدا ہو اور خلق نہ کرے لیکن یہ نہیں سوچا جا سکتا کہ خدا تو ہو لیکن وہ علم اور قدرت نہ رکھتا ہو۔

ہم یہ منطق نہیں مانتے اور خدا کی عدالت کو اپنے اصول دین کا ایک جزو سمجھتے ہیں۔[۱] اور قرآنی اور عقلی دلائل کے مطابق کہتے ہیں کہ خدا کے تمام کام عدل اور حکمت کے حامل ہوتے ہیں اور اس سے کوئی ظلم اور برا کام سرزد نہیں ہوتا۔

عدل الٰہی کے مسئلے پر سوالات بھی اُبھرتے ہیں:

پہلا سوال

کیا ابلیس کا پیدا کرنا خدا کی حکمت اور عدل سے مناسبت رکھتا ہے؟ کیا انسان کی تخلیق سے خدا کا مقصد عبادت نہیں تھا۔ اس لحاظ سے ابلیس جیسی مخلوق کا پیدا کرنا اس مقصد کے برخلاف ہے ۔علاوہ ازیں یہ کہ انسان بڑی مشقت اٹھا کر ایک عمل کرتا ہے لیکن مختلف غلطیاں اور وسوسے اس عمل کو تین طریقوں سے اکارت کر دیتے ہیں۔ یا تو یہ عمل دکھاوے کا ہونے کے باعث اپنی ابتدا ہی سے خدا کی بنائی ہوئی شکل اختیار نہیں کر پاتا یا درمیان میں غرور اس عمل کو ناکام بنا دیتا ہے یا انجام دہی کے بعد دوسرے گناہوں کی وجہ سے تمام اعمال رائیگاں اور برباد ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں کیا شیطان کی تخلیق خدا کے عدل اور حکمت سے میل کھاتی ہے؟

جواب

خدا نے ابلیس کو جو وجود اور قوتیں عطا کیں وہ سب کی سب اچھی تھیں اور وہ بھی برسوں تک عبادت میں مشغول رہا، اس کی بدی خدا کے حکم کی سرتابی تھی لیکن سرتابی کے گناہ سے بھی بدتر یہ بات تھی کہ اس نے توبہ اور استغفار بھی نہیں کی اور نہ ہی پچھتایا بلکہ بہت زیادہ گھمنڈ سے خدا کے حکم

۱) اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا ہر کام کو انجام دینے کی قدرت رکھتا ہے لیکن وہ حکمت کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا مثلاً ہم اپنی آنکھ پھوڑ لینے پر قادر ہیں لیکن نہیں پھوڑتے کیونکہ یہ دانائی کا کام نہیں ہے۔ چنانچہ خدا بھی ہر طرح کا کام کرنے کی قدرت تو رکھتا ہے مگر اس قدرت کو کام میں لانے کی شرط یہ ہے کہ اس کا ہر عمل عدل، حکمت اور اس کا ہر کام پہلے سے کے ہوئے وعدوں کے مطابق ہو۔ جس خدا نے مومنوں کو بہشت میں اور فاسقوں کو دوزخ میں بھیجنے کا وعدہ کر رکھا ہے اب اگر وہ اس کے خلاف عمل کرتا ہے تو اس طرح گویا وعدہ خلافی ہوتی ہے اور یہ ایک برا کام ہے جبکہ خدا اپنی قدرت سے کوئی برا کام کرتا ہے نہیں۔ ہم جو کہتے ہیں کہ خدا ظلم نہیں کر سکتا تو ہم نے اس کی قدرت گھٹائی نہیں ہے بلکہ اس کی حکمت جتائی ہے جو قدرت سے مناسب موقع پر کام لیتی ہے۔

کو غلط سمجھا اور کہنے لگا کہ یہ حکم درست نہیں ہے کیونکہ میری پیدائش جو آگ سے ہے، آدم کی پیدائش پر جو مٹی سے ہے برتری رکھتی ہے اس لیے شیطان کی سرکشی اور غرور خدا سے نہیں، خود اسی سے متعلق ہے۔

پھر بھی انسان کے لیے اس کے وسوسے ایسے نہیں ہیں جو اسے گناہ پر مجبور کر دیں۔ وسوسے کی استعداد، ایک دعوت (بلاوے) کی حد تک ہے لیکن وسوسوں سے ہمارا ارادہ ختم نہیں ہو جاتا اور اصولی طور پر ان وسوسوں کا ایک مفید پہلو بھی ہو سکتا ہے کیونکہ ہماری تربیت اور پختگی صرف دلی خواہشات اور شیطانی وسوسوں کی مخالفت میں مضمر ہے۔ اگر ایک شخص گونگا ہے اور اس نے غیبت نہیں کی تو یہ اس کی کوئی خوبی نہیں ہے۔ ہم خود ایسے لوگوں کو پہلوان کا لقب دے دیتے ہیں جو ہاتھ پر بھاری بوجھ اٹھا لیتے ہیں کیونکہ ان کا یہ عمل زمین کی کشش کے خلاف ہے۔ بیشک پہلوان ہونے کی پہچان کشش اور کھنچاؤ کی مخالفت ہے۔ پیغمبرؐ خدا نے فرمایا کہ اگر غصے نے تجھے برائی کی طرف کھینچا اور تو نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا تو تو (معنویت اور انسانیت کے میدان میں) پہلوانی کے مقام پر پہنچ گیا۔

ان سب باتوں سے قطع نظر فرض کیجئے کوئی شخص وسوسوں کے سامنے جھک گیا ہے تو اس کے لیے توبہ وستغفار کی راہ آخری فیصلے تک کھلی ہوئی ہے اور وہ توبہ کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اگر صرف ہم ہوتے اور شیطانی وسوسے تو دشواری کا مقام ہوتا لیکن اس کے وسوسوں کے مقابلے میں انبیائے کرامؑ کی دعوت اور عقل کی رہنمائی بھی موجود ہے جو سیدھی راہ پر چلنے میں ہماری بہترین مدد کر سکتی ہے۔ یہ سب باتیں ایک طرف اور دوسری طرف شیطانی وسوسہ خود ہماری گمراہیوں کے پیچھے پیچھے ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہی ہمیں اپنے پیچھے کھینچتا ہے بلکہ ہم بھی اسے اپنی طرف کھینچتے ہیں اس لیے قرآن اس عیاش عالم کے قصے میں کہتا ہے:

اور (اے رسولؐ!) تم ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنا دو جسے ہم نے اپنی آیتیں عطا کی تھیں پھر وہ ان سے نکل بھاگا تو شیطان نے اس کا پیچھا پکڑا اور آخر کار وہ گمراہ ہو گیا۔

(سورۂ اعراف۔ ۱۷۵)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان ایسے لوگوں کے پاس پہنچتا ہے جو خود اپنے اعمال سے اس کے لیے آمادگی کا اعلان کرتے ہیں۔اس آیت میں جو شخص مدِّ نظر ہے وہ بلعم باعور نامی ایک عالم تھا جو بنی اسرائیل میں سے تھا خدا نے اسے چند علمی باتیں سکھا دی تھیں جن کی وجہ سے اس کی دعا قبول ہو جاتی تھی لیکن اس نے دربارِ فرعون سے تعلق پیدا کر لیا چنانچہ مال و منصب کے لالچ نے اسے خدا کی نشانیوں اور ان علوم سے جو اسے حاصل تھے جدا کر دیا اور پھر شیطان نے اس کا پیچھا پکڑا۔

ہم دوسری آیت میں پڑھتے ہیں:

اس کا بس چلتا ہے تو بس انہیں لوگوں پر جو اسے اپنا دوست بناتے ہیں۔

(سورۂ نحل۔آیت ۱۰۰)

جب تک ہم میں اس کے ہمراہ چلنے کی خواہش نہیں ہوگی وہ ہماری رہبری کا ذمہ نہیں لے گا اس لیے قرآن کہتا ہے:

اس میں شک نہیں کہ جو لوگ ایماندار ہیں اور اپنے پروردگار پر بھروسا رکھتے ہیں ان پر اس کا قابو نہیں چلتا۔(سورۂ نحل۔آیت ۹۹)

قابو نہ چلنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ لالچ بھی نہیں دیتا بلکہ مراد یہ ہے کہ شیطان کو پہچاننے والے یہ سچے مومن ہیں جو اس کے وسوسوں سے ٹکر لیتے ہیں اور اس سے پہلے کہ اس کے اثر اور غلبے میں آئیں چوکنّا ہو جاتے ہیں۔قرآن، شیطان کیساتھ مومنین کے تصادم کے طریقے کو اس طرح بیان کرتا ہے:

''پرہیزگار لوگ وہ ہیں کہ جیسے ہی کوئی شیطانی گروہ ان سے چھو جاتا ہے وہ چوکنا ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو بچا لیتے ہیں۔''

(سورۂ اعراف۔آیت ۲۰۱)

اس لیے شیطان سے مومن کا تعلق تصادم کا ہے لیکن شیطان سے فاسق کا تعلق ہے وہ ہے جو

کسی انسان کا اپنے پاس بیٹھنے والے سے ہوتا ہے:

اور جو شخص خدا کی یاد سے اندھا بنتا ہے ہم (گویا خود) اس کے واسطے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں تو وہی اسکا ساتھی ہے۔(سورۂ زخرف۔آیت ۳۶)

مختصر یہ کہ شیطان ایسی مخلوق ہے جو اپنی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ کام لے سکتا تھا لیکن اس نے غرور اور ضد کی وجہ سے اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔اس کی تباہی کا تعلق اس کی ذات سے تھا۔شیطانی وسوسے ہمیں بے بسی اور گمراہی پر مجبور نہیں کر سکتے۔دھوکا کھانے والوں کے لئے توبہ کا راستہ کھلا ہوا ہے اور شیطان کے اثر و رسوخ کی راہ ہموار کرنا بھی خود ہمارے ہی ہاتھ میں ہے۔ان باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شیطان کا پیدا کرنا خدا کے عدل کے خلاف ہے۔

دوسرا سوال

ایک بات جو عدل الٰہی کی بحث میں بہت زیادہ پوچھی جاتی ہے وہ ناقص الخلقت افراد کا مسئلہ ہے۔لوگ پوچھتے ہیں کہ اگر خدا عادل ہے تو یہ ناقص الخلقت انسان جو پوری عمر تکلیف میں گزارتے ہیں اور لوگوں کی طرف سے توہین کا نشانہ بنتے ہیں کس لیے پیدا کیے گئے ہیں؟

جواب

بہت سے ناخوشگوار واقعات کے وجود میں آنے کا سبب ہم خود ہیں۔ناقص الخلقت افراد بھی ہماری اسی کاہلی کا ثبوت ہیں۔یہ والدین ہیں جنہیں حفظانِ صحت کے اصولوں اور نفسیات کے مسائل کا خیال رکھنا چاہیے کیونکہ کاہلی برتنے سے ناقص بچہ پیدا ہوتا ہے۔خوش قسمتی سے ہمارے معصوم پیشواؤں کی روایات میں ان مسائل کی طرف توجہ دی گئی ہے۔نشے،حیض یا فوڈ پوائزن کی حالت یا پریشانی میں ہم بستری نومولود پر برے اثرات ڈالتی ہے۔

بچے کا گناہ کیا ہے؟

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بچے کا گناہ کیا ہے؟

ہمارا جواب صرف ایک جملہ ہے اور وہ یہ کہ خدا کا گناہ کیا ہے؟ یہاں نومولود بچہ بھی بے قصور اور خدائے پاک بھی بری ہے۔قصور وار صرف والدین ہیں لیکن اس کی تکلیف بچے کے لیے ہے۔یہ بات صرف نومولود سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا کے تمام مظالم میں قصور ظالم کا ہوتا ہے اور تکلیف مظلوم کے سر پڑتی ہے۔

اگر میں نے ایک پتھر آپ کی طرف کھینچ مارا اور آپ کا ماتھا زخمی ہو گیا تو نہ آپ گنہگار ہوئے نہ خدا۔گناہ تو میرا ہے کہ میں نے پتھر مارا لیکن اس گناہ کی ایذا آپ اٹھا رہے ہیں۔چنانچہ جب سوال کیا جاتا ہے کہ والدین نے غلطیاں کی ہیں تو بچے کا کیا گناہ ہے؟اسی طرح کا سوال تمام ظلموں کے متعلق کیا جا سکتا ہے کہ ظالموں نے قصور کیا ہے تو مظلوموں کا کیا گناہ ہے؟

اگر آپ نمکین یا کڑوا خمیر نانبائی کے پاس لے گئے اور اس نے نمکین یا کڑوی روٹی دیدی تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ نانبائی ظالم ہے؟

اس مقام پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ والدین کو خبر نہیں تھی کہ ان کا یہ عمل قوانین الٰہی کے تحت نومولود بچے پر برا اثر ڈالے گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ماں باپ کا جاننا نہ جاننا اشیاء کے قدرتی خواص پر اثر نہیں ڈالتا۔ہم یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ فلاں تار میں بجلی کی رو دوڑ رہی ہے اور اس پر ہاتھ رکھ دیں تو بجلی ہمیں مار ڈالے گی۔

اگر ہم پانی کے دھوکے میں شراب پی جائیں تو ہمیں نشہ ہو جائے گا کیونکہ مست کر دینا شراب کے قدرتی خواص میں شامل ہے چاہے ہم اسے پانی سمجھیں یا کچھ اور اس لیے والدین کی بیگناہی ان معنوں میں ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر گناہ نہیں کیا۔تاہم کسی عمل کے قدرتی اور ذاتی اثرات بدستور اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں۔

دوسرا سوال پیدائشی اپاہج افراد کی توہین کے بارے میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ لوگوں کا ان کی توہین کرنے کا تعلق نہ خدا سے ہے نہ کسی اور سے بلکہ یہ فعل ان لوگوں کی سمجھ سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمیں پیدائشی اپاہج افراد کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے، اس بارے میں اسلام کے مقدس آئین میں کافی ہدایات دی گئی ہیں۔آخری مسئلہ جو حکومت کی ذمہ داری سے تعلق رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ حکومت احترام کے ساتھ ان معذور افراد کی زندگی کی حفاظت کرے اور ہر ایک کے لیے اس کی دلچسپی، صلاحیت اور طاقت کے مطابق آسان کام اس کی آسائش کی حد تک آمدنی کے ساتھ مہیا کرے اور اس وسیلے سے ان بھائیوں اور بہنوں کی محنتوں اور مشقتوں کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ ادا کرے۔

سماجی انصاف کا الٰہی جہاں بینی سے تعلق

سماج میں پائے جانے والے تمام بڑے بڑے نعرے جب تک اس کی اصل جڑ سے قوت نہیں پاتے نعرے کی حد سے آگے نہیں نکلتے۔سماجی انصاف کا نعرہ بھی انہیں نعروں میں سے ہے جنکی حمایت کا ہر حکومت دم بھرتی ہے اور اپنے آپ کو اس کا حامی گردانتی ہے لیکن آپ کو کسی عہد حکومت میں اس کا نشان نظر نہیں آئے گا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نعرے کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسلام میں مساوات اور برابری گہری جڑیں رکھتی ہیں مثلاً:

۱) پوری کائنات خدائے حکیم کی نگرانی میں ہے اور غیر منظم نہیں ہے کہ میں اس دنیا کا ایک جزو ہوتے ہوئے ہر کام میں اپنی من مانی کروں اور صرف اپنی ہی ذات کو آگے رکھوں۔

۲) ہمارا طرزِ عمل اور کردار بلکہ خیالات تک نگرانی میں ہیں اور ہمارا خدا پردۂ غیب سے انہیں دیکھ رہا ہے اور اس کے دربار میں ہم سب کی پیشی ہونا ہے۔

۳) ہم سب مٹی سے پیدا ہوئے اور آخر مٹی ہی میں مل جائیں گے۔مٹی کے ذروں میں کوئی فرق نہیں ہے کہ میرے اور کسی دوسرے میں بھی کوئی فرق ہو۔

۴) سب لوگوں خدا کے بندے ہیں۔ان سے محبت رکھنا خدا کی خوشنودی کا سبب ہے اوران کی سب سے زیادہ بھلائی چاہنے والا سب سے اچھا آدمی ہوتا ہے۔

۵) موجودات اس حداور قانونی حق سے آگے نہیں بڑھ سکتیں جو پیدا کرنے والے نے ان کے لیے مقرر کیا ہے۔

۶) ہم سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔

دنیااور انسان کی یہ تشریح اور تعبیر جو دراصل جہان بینی ہے عدل اور انصاف کے اصول کو قبول کرنے کی سب سے زیادہ سازگار بنیاد ہے لیکن ماحول، دوست اور ہوس اس بنیاد کو ڈھانے والے ہیں۔

انصاف کی خواہش قدرتی ہے

قرآن فرماتا ہے کہ ہم نے اچھائیوں اور برائیوں کا علم انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے: پھر اس کی بدکاری اور پرہیزگاری کو اسے سمجھا دیا ہے۔(سورۂ شمس۔آیت ۸)

ایک بچے کو دیکھیے جو اپنا سیب آپ کے پاس رکھوا کر چلا جاتا ہے اور جب وہ پانی پی کر واپس آتا ہے اور دیکھتا ہے کہ آپ نے تھوڑا سا سیب کھالیا ہے تو ناخوش ہوجاتا ہے اور ایسی نظر سے دیکھتا ہے جیسے کہہ رہا ہو کہ میں نے آپ کو امانت دار سمجھ کر اپنا سیب رکھوایا تھا، پھر آپ نے امانت میں خیانت کیوں کی؟ یہ بات بچے کے ذہن میں ہے چاہے وہ اسے زبان پر لائے یا نہ لائے۔دیکھیے خیانت کی برائی ایک ایسی بات ہے جس کے بتانے کے لیے کسی استاد یا اتالیق کی ضرورت نہیں پڑتی۔

کبھی کچھ لوگ آپس میں مل کر اپنے عملی وسائل اکٹھے کرتے ہیں اور پھر چوری کی ایک واردات کرتے ہیں لیکن جب مسروقہ مال کے بٹوارے کا وقت آتا ہے تو کہتے ہیں کہ آؤ اب ہم مال کو آپس میں انصاف سے بانٹ لیں۔یہ بات کبھی کبھی غیر شعوری طور پر کہہ دی جاتی ہے لیکن وہ اس بات کو زبان پر نہ بھی لائیں تو بھی دل میں منصفانہ تقسیم کو ہی پسند کرتے ہیں۔

منصفانہ قانون صرف انبیاءؑ کے طرزِ فکر میں ملتا ہے

شاید ہی کوئی ایسا سماج ہوگا جو حق، قانون اور انصاف کی بات نہ کرتا ہو شاید ہی کوئی ایسی انتظامیہ ہو جو اپنے آپ کو سماج کے حقوق اور اس کے مفادات کا حامی نہ سمجھتی ہو۔اب ہم اس سلسلے میں چند سوالات قائم کرتے ہیں مثلاً:

۱) کون سا قانون سو فیصدی منصفانہ ہوسکتا ہے کہ کسی ایک شخص یا ایک طبقے پر بھی زیادتی نہ کرے؟

۲) ایسا کون سا قانون ساز ہے کہ جس کی ذاتی ہوا و ہوس کا اس کے بنائے ہوئے قانون پر اثر نہ پڑا ہو؟

۳) قوانین کو کس معیار کی رو سے منصفانہ قرار دیا جاتا ہے؟

۴) قانون ساز کس سماجی مقام سے بات کرتے ہیں اور کس طبقے اور گروہ کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں؟

۵) فرض کیا کہ قانون ساز سیاسی پارٹی، قبیلے، علاقے اور نسل کی جانبداریوں سے آزاد ہیں تو وہ کس مقام سے تمام انسانوں پر توجہ دیں کہ ان قوانین کا ردعمل جلدی یا دیر سے لوگوں کے لیے ضرر رساں نہ ہو؟

ان سوالات کی رو سے ہمارا نظریہ یہی ہے کہ سماجی انصاف، عادلانہ قانون سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا امکان خدا کی راہ اور انبیاءؑ کے طرزِ فکر کے علاوہ اور کہیں نہیں ہے۔

انصاف بنیادی شرط ہے

اسلام میں تمام اہم اسامیاں منصف لوگوں کے سپرد ہوتی ہیں۔ایسے لوگ جن کی سابقہ کارکردگی عوام کے نزدیک خراب نہ ہو اور جو قابلیت اور پرہیز گاری میں مشہور ہوں۔انصاف کرنے میں قاضی سے لیکر عدالت کے اہل کار اور گواہ تک سب کو چاہیے کہ وہ جس مقام پر بھی ہوں انصاف کی بات کریں اور لکھیں۔نمازِ جمعہ و جماعت میں پیش نماز عادل ہو۔مرجع تقلید، صدر، وزیر اعظم اور بیت المال کے ناظم سے لیکر طلاق کے معاملے میں عدالت ضروری ہے۔خبر دینے میں صرف عادل لوگوں کی دی ہوئی خبر پر اطمینان ہوسکتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ انصاف کا ایک لمحہ ایسے ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے جن کے دن تم روزہ رکھ کر اور راتیں بیداری میں بسر کرو۔ (جامع السعادات جلد ۲ صفحہ ۲۲۳)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے:

''عادل رہبر کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی۔'' (نظام الاسلام السیاسی، صفحہ ۷۱)

انبیاءؑ کا ایک مقصد ایسے سماج کی تشکیل ہے جس میں لوگ انصاف قائم کریں اور دوست دشمن کے ساتھ تمام خاندانی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی تعلقات میں منصفانہ رویہ رکھتے ہوں۔

انبیاءؑ کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں خدا اور قیامت کا ایسا عقیدہ ابھاریں اور فرد اور سماج کے رگ و پے میں ایسے اخلاق اور خدائی سوچ کا انداز پیدا کریں کہ لوگ خود انصاف کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں: ''اور میزان نازل کی تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔'' (سورۂ حدید۔آیت ۲۵)

جب لوگ امیر المومنین امام علی علیہ السلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ آپ مال کو برابر کیوں تقسیم کرتے ہیں تو آپ فرماتے ہیں:

اگر یہ میرا ذاتی مال ہوتا تب بھی میں اسے برابر تقسیم کرتا چہ جائیکہ یہ مال خدا کا ہے اور عوام سے متعلق ہے اس لیے اس میں سبھی لوگوں کا حق ہے۔ (نہج البلاغہ، مترجم مفتی جعفر حسین۔خطبہ ۱۲۴)

امامؑ کے سامنے لوگوں کو خرید لینے کی تجویز

کچھ خیر خواہ امیر المومنینؑ کی خدمت میں پہنچے اور کہنے لگے: آپ عرب اور قریش کے سر برآوردہ لوگوں کو بڑا حصہ دیا کیجیے اور اس طرح انہیں اپنے گرد جمع کر لیجئے کیونکہ اگر آپ ان کو غلاموں اور غیر عربوں پر ترجیح نہیں دینگے تو ممکن ہے کہ یا تو وہ تخریب کاری کرنے لگیں یا آپ کو چھوڑ کر معاویہ سے جا ملیں۔

امیر المومنینؑ نے فرمایا: کیا میں بیت المال کی رقم لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے میں خرچ کروں، کیا انہیں خراج دوں؟ واقعہ یہ ہے کہ جو کوئی رقم لیکر میرا طرفدار ہوگا اسے جب دوسری طرف سے زیادہ رقم ملے گی تو وہ میرا مخالف ہو جائے گا۔ ہمیں چاہیے کہ انصاف اور نظریے کا تحفظ کریں اور

لوگوں کو دھمکا کر یا لالچ دیکر اپنی طرف کھینچ لینے کا نظریہ نہ رکھیں۔ میں کبھی کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دوں گا جس کا جی چاہے رہے، جس کا جی چاہے چلا جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبے میں لوگوں کو جمع کر کے فرمایا تھا: تمام مسلمان آپس میں برابر ہیں، چاہے وہ کسی قبیلے، نسل اور زبان سے تعلق رکھتے ہوں (سفینۃ البحار، جلد ۲، صفحہ ۳۴۸) آپ نے اپنے عہد میں غلاموں کو بڑے بڑے منصب عطا فرمائے۔ کالے گوروں میں شادیاں کروائیں یہاں تک کہ اپنی پھوپھی کی بیٹی کا نکاح ایک کالے غلام سے کر دیا تا کہ اپنے آپ کو برتر سمجھنے کا مسئلہ ہی ختم ہو جائے۔

کاغذ کو کفایت سے استعمال کرو

امیر المومنینؑ نے ایک خط میں اپنے عمال کو یوں لکھا: اپنے قلم کی نوک تیز کر لو۔ لکھتے وقت سطروں کے درمیان فاصلہ زیادہ نہ رکھو۔ بیکار باتیں حذف کر دو۔ عبارت آرائی کی بجائے اصل مطلب پر توجہ رکھو۔ لمبی چوڑی تحریر اور زیادہ کاغذ خرچ کرنے سے بچو یہ کاغذ بیت المال کا ہے اور بیت المال ایسا ضیاع برداشت نہیں کر سکتا۔ (بحار الانوار، جلد ۴۱۔ صفحہ ۱۰۵)

نہج البلاغہ کے خطبہ ۲۲۱ میں انصاف کی اہمیت اور ظلم سے اجتناب کے بارے میں امام علیہ السلام کا بیان بہت دلچسپ ہے۔ اس خطبے میں آپ مزید فرماتے ہیں: خدا کی قسم! اگر مجھے ہفت اقلیم ان چیزوں سمیت جو آسمانوں کے نیچے ہیں اس لیے دیدی جائیں کہ میں چیونٹی کے منہ سے جَو کا چھلکا چھین لینے کے برابر ہی خدا کی نافرمانی کروں تو میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔ خدا کی قسم! اگر لوگ مجھے شام سے صبح تک تیز تلواروں پر لٹائیں تو یہ میرے لیے اس سے بہتر ہے کہ میں خدا اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ظالموں میں شمار کیا جاؤں۔

کافروں اور دشمنوں سے متعلق انصاف

اسلام میں نہ صرف عام حالات میں دوستوں سے بلکہ لڑائی کی حالت میں دشمنوں سے بھی

انصاف کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

۱) اگر دشمن تم لوگوں کو قتل کرتے ہیں تو تم بھی انہیں قتل کرو۔ بے شک کافروں کی یہی سزا ہے (سورہ بقرہ۔آیت ۱۹۱) اس موقع پر قتل کرنا ہی انصاف ہے اور ایسا نہ کرنا بزدلی اور ناطاقتی ہے لیکن یہ دھیان رہے کہ حملہ کسی صورت میں تمہاری طرف سے نہ ہو بلکہ جس طرح کا وہ تم پر حملہ کریں تم ان کا ویسا ہی مقابلہ کرو۔

۲) جو شخص بے قصور اور مظلوم مارا جائے اس کے وارث کو ہم نے حق اور اختیار دیدیا ہے (کہ اگر چاہے تو قصاص میں مار ڈالے یا چاہے تو خوں بہا لے لے) لیکن قتل ہونے والے آدمی کے وارثوں اور سرپرستوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بدلہ لینے یا مار ڈالنے میں تجاوز کریں (سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۳۳)

یہ جاہلیت کے دنوں کے ایک تعصب کی طرف اشارہ ہے کہ جب کسی خاندان کا کوئی شخص مارا جاتا تھا تو پورا خاندان اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور جب تک اس ایک شخص کے بدلے میں چند آدمیوں کو نہیں مار ڈالتے تھے چین نہیں لیتے تھے لیکن اس بیجا تعصب کے مقابلے میں قرآن انصاف کا حکم دیتا ہے اور کہتا ہے: قصاص اور بدلے میں زیادتی نہ کرو۔ تمہیں صرف اتنا حق حاصل ہے کہ اس قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچاؤ۔

خوں بہا اور قصاص سماجی انصاف کے ضامن ہیں

اے عقلمندو! قصاص (کے قواعد مقرر کر دینے) میں تمہاری زندگی ہے۔ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۷۹)

اسلام میں قصاص کا قانون نہایت منصفانہ ہے کیونکہ وہ یہودیوں کی طرح صرف قصاص پر ہی بھروسا نہیں کرتا نہ آج کل کی مسیحیت کی طرح اپنے پیروکاروں کے لیے صرف معافی یا خوں بہا کا طریقہ تجویز کرتا ہے کیونکہ کبھی کبھی قصاص پر اصرار خرابیاں پیدا کرتا ہے، بنابریں اس کا لازمی ہونا عقل سے دور ہے مثلاً قاتل اور مقتول دونوں بھائی ہیں یا رشتہ دار ہیں تو ایسی صورت میں قصاص لینا خاندان کے لیے زیادہ غم واندوہ کا موجب ہے، دوسری طرف صرف خوں بہا اور معافی

کا قانون قاتل کو اور دوسرے مجرموں کو جرأت دلانے کا سبب ہے۔لہٰذا اسلام نے اصلی حکم قصاص ہی کا رکھا ہے لیکن اس کے ساتھ معافی اور خوں بہا کا اصول بھی رکھا ہے اور مقتول کے وارثوں کو دونوں صورتوں میں سے کسی ایک پر عمل کرنے کا اختیار دیدیا ہے۔

عدالت کی حفاظت کرنیوالے پیغمبر، امام اور فقیہ

چونکہ زندگی میں انسانوں کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔اس لیے قدرتی طور پر جھگڑا اور الجھاؤ پیدا ہوجاتا ہے۔ہر فریق یا تو اپنے آپ کو حقدار سمجھتا ہے یا جو کچھ وہ کہہ چکا ہے اس سے دستبردار ہونے کو آمادہ نہیں ہوتا۔اس موقع پر اسلام نے قیام انصاف کے لیے لوگوں کو انبیاءؑ کی طرف متوجہ کرایا اور کہا ہے؛ اگر تم میں کسی بات پر جھگڑا ہو تو خدا اور اس کے پیغمبرؐ کی طرف رجوع کرو۔تمہارا رجوع کرنا خدا اور قیامت پر تمہارے سچے ایمان کی علامت ہے۔(سورہ نساء آیت ۵۹) یہ حدیث بھی قابل توجہ ہے جو کہتے ہے کہ ''علماء انبیاؑ کے وارث ہیں۔'' (ولایت فقیہ۔آیت اللہ خمینیؒ) جھگڑے کے موقعوں پر جبکہ انصاف کی راہ سے برگشتگی اور ایک دوسرے کے حقوق پر ناجائز تصرف کا خطرہ درپیش ہو تو منصف مزاج عالموں کے پاس جاؤ تاکہ وہ حکمِ خدا کے مطابق فیصلہ دیں۔(ولایت فقیہ)

جو شخص جھگڑوں میں مرجع تقلید عالم کے پاس نہیں جاتا بلکہ اپنے مناقشے طاغوتی کچہریوں میں لے جاتا ہے اور ظالموں سے انصاف کی امید رکھتا ہے، اسے اپنے ایمان پر نظرثانی کرنا چاہیے کیونکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔قرآن کہتا ہے: کیاں آپ نے ایسے لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں اور ان خدائی احکام پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر اور آپ سے پہلے کے پیغمبروں پر نازل ہوئے ہیں لیکن عمل میں وہ طاغوت کی طرف جھکے ہوئے ہیں اور اپنے جھگڑوں کے حل کے لیے آپ کے پاس نہیں آتے۔یہ لوگ بزعم خود اپنے آپ کو ایمان والے سمجھتے ہیں لیکن وہ ہرگز مسلمان نہیں ہیں کیونکہ ہم نے انہیں حکم دیا تھا کہ طاغوت کے نزدیک نہ پھٹکو اور اس سے برگشتہ رہو لیکن انہوں نے نافرمانی کی اور شاید اس پر کان نہیں دھرا۔(سورہ نساء۔آیت ۶۰)

نبوّت

الٰہی جہاں بینی اور دنیا اور انسان کی اس تفسیر میں جو ہمارے پاس ہے پیغمبروں کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اگر اس کائنات کی کوئی غایت ہے اور یہ اپنے صحیح راستے پر چل رہی ہے تو ضروری ہے کہ انسان کا بھی جو اسی دنیا کا ایک جزو ہے کوئی ایسا ہی صحیح راستہ ہو جو ہر قسم کی غلطی، لغزش اور خامی سے دور ہو اور وہی نبیوں کا راستہ ہے۔ اگر انسان کا راستہ ایسا نہیں ہوگا تو انسان دنیا کا بے جوڑ پیوند ہو جائے گا۔ اگر انسان کی پیدائش کا کوئی مقصد ہے تو یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی منزل اور دائمی نیک بختی تک رسائی حاصل کرے۔ راستے کے مکمل نقشے اور مکمل ایڈریس کے بغیر یہ مقصد ممکن الحصول نہیں ہے اور انبیاء یہ نقشہ اور صحیح ایڈریس دینے کے ذمہ دار ہیں، چونکہ انسان بھلکڑ ہے اس لیے اسے ایک خبردار کرنے والے کی بھی ضرورت ہے اور انبیاء سماج کو ایسے ہی ڈرانے اور خبردار کرنے والے ہیں۔

اگر انسان ذمہ دار ہے اور اسے خدا کے دربارِ عدل میں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے تو پھر اس کے لیے کسی احکام بیان کرنے والے اور ذمہ داریاں بتانے والے کی بھی ضرورت ہے اور وہ ہیں خدا کے بھیجے ہوئے گرامی قدر پیغمبر۔

اگر انسان کو اپنی شخصیت کی تعمیر کرنا ہے تو اس کے سامنے کوئی مثال اور نمونہ بھی ہونا چاہیے چنانچہ انبیاء ہی انسان کامل کے بہترین نمونے ہیں۔

اگر انسان کو اپنے مستقبل کی فکر کرنا ہے تو کوئی ایسا شخص بھی موجود ہونا چاہیے جو اس کے لیے مستقبل کی تشریح کرے۔ اس قسم کی تفسیر اور نظریے سے بہرمند ہونے کے لیے بھی نبیوں ہی کا نقشِ قدم انسانیت کے قافلے کے سامنے آتا ہے۔

اس کے برعکس مادی جہاں بینی میں نبوت کا مسئلہ موجود نہیں ہے، کیونکہ اس نظریے کے مطابق زندگی کا پہلے سے مقرر کیا ہوا کوئی راستہ اور مقصد نہیں ہے۔ انسان پہلے سے تیار کیے ہوئے کسی خاکے اور نقشے کے بغیر ہی پیدا ہوا ہے اور اسے کچھ وقت کے بعد مٹ جانا ہے۔

ہم نے جو عقل کی رہنمائی میں الٰہی جہاں بینی کا انتخاب کیا ہے اور یہ مان لیا ہے کہ تخلیق کا ایک مقصد ہے، وہ ایک معینہ راستے پر گامزن ہے۔ تمام موجودات، خدا کی نگرانی میں انسان کی دسترس میں ہیں کیونکہ وہ اس کے استفادے کے لیے پیدا ہوئی ہیں، پھر ہم کس طرح یہ بات تسلیم کر لیں کہ خود انسان ۔۔۔ خدا کا خلیفہ اور اشرف المخلوقات جو تمام موجودات میں اکیلا صاحب اختیار و انتخاب ہے ۔۔۔ کسی راستے اور رہنما کے بغیر اس کائنات میں یونہی حیران پریشان اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

انبیاء کا کام اور انکی ضرورت ہم پر اس وقت واضح ہوتی ہے جب ہم آسمانی نظریے اور انسانی نظریات کا باہم موازنہ کریں، انسانی نظریات کی خامیوں سے واقف ہوں اور نبیوں کے نظریے کے تحت تربیت پائے ہوئے مثالی انسانوں کا دوسروں سے تعارف کرائیں۔

علم اور عقل کی ضرورت

اسلام علم اور عقل کو بہت اہمیت دیتا ہے یہاں تک کہ وہ عقل کو باطنی پیغمبرؑ سمجھتا ہے اور اس نے جزا و سزا کا تعین عقل کی بنیاد پر کیا ہے۔ قرآن بار بار عقل کو کام میں لانے کا حکم دیتا ہے۔ اس نے بہت سی آیتوں میں بنیادی طور پر صرف سوچنے والوں اور عقل رکھنے والوں کو مخاطب کیا ہے۔ عقل کا تعارف کرانے میں اسلام نے بہترین مثالیں دی ہیں۔ وہ کہتا ہے عقل وہ ہے جس کے ذریعے سے خدا کی عبادت کی جاتی ہے۔ ہمارے معصوم پیشواؤں کی روایات میں عقل اور فکر

کی اتنی تعریف کی گئی ہے کہ کم چیزوں کی اتنی قدردانی ہوئی ہوگی چنانچہ جس وقت امام کے سامنے ایک شخص کی کثیر عابدتوں کا ذکر آتا ہے تو امام فرماتے ہیں، وہ کس طرح سوچتا ہے؟

۱۔ علم اور عقل کی محدودیت

لیکن انسان کا علم محدود ہے۔روز بروز درسگاہوں اور علوم وعنوان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ انسان نئی نئی ایجادیں اور دریافتیں کررہا ہے۔انسان کو اس کے علم اور عقل پر چھوڑ بیٹھنا دراصل اسے پتھروں میں سرگرداں کرنا ہے۔

بے شک انسان کی واقفیت کم ہے۔نہ وہ ماضی کی صحیح خبر رکھتا ہے نہ مستقبل کی اور نہ اپنے کام کے فوری یا تدریجی ردعمل سے ہی اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔تمام ملکوں میں قوانین کی آئے دن کی تبدیلی اور ہر انسان کے ارادوں کی تبدیلی اس محدودیت کی دوسری واضح علامت ہے۔

۲۔ علم سمجھتا ہے لیکن صدیوں کے بعد

وقت گزرنے اور علم کے بڑھنے سے کبھی کبھی بعض حقائق تک انسان کی رسائی ہوجاتی ہے لیکن اس دسترس میں جو سینکڑوں سال کی تاخیر ہوئی اس گناہ کی ذمہ داری ہم کس کے سر ڈالیں؟ مثلاً یہ ثابت ہوئے تقریباً آدھی صدی ہوئی ہے کہ سؤر کا گوشت کھانا کدودانوں اور تشین کیڑوں (TAPWORM) اور (TAENIA) کی پیدائش اور افزائش کا سبب ہوتا ہے۔انسان اس بات کو سالہا سال کے بعد سمجھ پایا ہے لیکن جن لوگوں کو وحی کے ذریعے سے معلوم ہوگیا تھا کہ سؤر کا گوشت حرام ہے، وہ صدیوں سے اس کے نقصان سے محفوظ چلے آرہے ہیں۔اسلام میں ایسے دسیوں احکام ہیں جن کی غایات پر سے وقت کی گزران اور علم کی ترقی نے پردہ اٹھایا لیکن نبیوں کے طرزِ فکر کے پیروکاروں نے پہلے ہی دن سے وہ راہِ اختیار کر لی تھی جہاں اپنے علم اور تجربے پر بھروسا کرنے والے اسکالرز صدیوں بعد پہنچ پائے۔

۳۔ انسان اپنے علم، عقل، مشورے اور غور وفکر سے صرف محسوس اور مادّی مسئلوں میں قدم بڑھاتا اور کوئی راستا اختیار کرتا ہے لیکن دائمی نیک بختی، باطنی ترقی اور روحانی تربیت کے لیے جس

کی پہچان سے انسان قاصر ہے وحی اور نبیوں کے طریقے کے سوا ہمارے لیے کوئی راہ نہیں ہے۔

۴۔ ان لوگوں کے سوچ کے برعکس جو یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی رہنمائی کے لیے ضمیر ہی کافی ہے اور ہمیں نبیوں کی رہنمائی کی مزید ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ ضمیر ہمارا اور ہمارے معاشرے کا بہت زیادہ پابند ہے۔ وہ ماحول اور رسم و رواج کا اثر قبول کر لیتا ہے اور حقائق کا پتا نہیں دیتا عادت اور ماحول کے زیرِ اثر رفتہ رفتہ انسان اس منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کڑوے سگریٹ کے پینے سے بھی لطف لینے لگتا ہے جسے ہر روشن ضمیر پہلی بار مسترد کر دیتا ہے۔ ہم ایسے لوگوں کو جانتے ہیں جو کسی پرندے کا سر کاٹنے سے خوف کھاتے تھے اور ان کا ضمیر اس کی اجازت نہیں دیتا تھا لیکن پرندوں کو بار بار ذبح کرنے کے عمل نے ان کے اس جذبے اور ضمیر کی کیفیت کو تبدیل کر ڈالا۔ اس صورت میں ضمیر پر کیونکر بھروسا کیا جا سکتا ہے جبکہ ہر فرد کے ضمیر کا فیصلہ ایک الگ حکم رکھتا ہے۔

۵۔ پانچویں بات جو انسان کے لیے انبیاءؑ کی ضرورت کو واضح اور انسانی قوانین پر ہمارے اعتماد کو کم کرتی ہے وہ کچھ فطری شکوک ہیں جو ہر انسان کے سامنے موجود ہیں مثلاً ان لوگوں نے اپنے علم اور عقل پر بھروسا کر کے ہمارے لیے قانون بنائے ہیں تو:

الف) انہوں نے انسانی فطرت کے تمام پہلوؤں کو کس طرح سمجھ لیا اور انسان کی ضرورت کو کیسے جان لیا؟

ب) انہوں نے اپنے اندر انسان کی خیر خواہی کا جذبہ کس طرح پیدا کر لیا ہے؟

ج) وہ جو قانون اور طریقۂ عمل پیش کرتے ہیں اس میں انہوں نے بھول اور غلطی کیوں کر نہ کی ہوگی؟

د) انہوں نے کسی فرد یا کسی گروہ کا مفاد کیسے سامنے نہ رکھا ہوگا اور اپنے ماحول یا خاندانی، قبائلی اور اقتصادی نظام کے زیرِ اثر اپنی صحیح پہچان کا راستہ کیسے نہیں بدلا ہوگا؟

ہ) ان کے بنائے ہوئے قاعدوں کا ردِّ عمل جلدی یا دیر سے فرد یا سماج کے لیے کیسے مضر نہیں

ہوگا؟

ایسے بہت سے شکوک ہیں جو انسانی حقوق کے حامیوں اور سماجی انصاف کا دم بھرنے والوں کی غلط کارکردگی کی موجودگی میں اب یقین سے بدل گئے ہیں۔

سائنس کی محدودیت وانبیاء کے دائرہ کار کی وسعت

ہم نے اپنی سابقہ گفتگو میں کہا ہے کہ انسانی علم نبیوں کا سا کام نہیں کرتا۔ اب ہم ان تمام باتوں کا نچوڑ عام فہم اور مختصر الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

- علم فطرت کو کنٹرول کرتا ہے اور انبیاءؑ انسان کو۔
- علم ہمیں آلات ووسائل بخشتا ہے اور نبی ہمیں مقصد عطا کرتے ہیں۔
- علم ہمیں تیزی دیتا ہے، انبیاءؑ ہمیں جہت بخشتے ہیں۔
- علم صرف ظاہری تبدیلی کی بنیاد رکھتا ہے، نبی باطنی تبدیلی بھی کرتے ہیں۔
- علم وسعت بخشتا ہے، انبیاءؑ عظمت اور بلندی عطا کرتے ہیں۔
- علم صرف چراغ ہے اور مذہب چراغ بھی ہے اور راستہ بھی۔
- اہلِ علم کے فکر ونظر میں تضاد ہوتا ہے لیکن تمام نبیوں کی سمت ایک ہی ہے۔

کبھی کبھی علم محض خیال پر مبنی ہوتا ہے۔ یعنی انسان خیال کرتا ہے کہ وہ سمجھ گیا لیکن اسے بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں سمجھا ہے لیکن وحی میں خیال کو کوئی دخل نہیں ہے۔

غرض یہ کہ ہم اپنے زمانے میں دیکھ رہے ہیں کہ علم روز بروز وسیع ہوتا جارہا ہے لیکن جرائم کی تعداد میں کوئی کمی نہیں ہورہی۔

آپ جب بیمار پڑتے ہیں تو اپنے آپ کو طبیب کے اختیار میں دے دیتے ہیں اور اپنی کار خراب ہونے پر مکینک کے سپرد کردیتے ہیں۔ اس کا سبب بھی ظاہر ہے کہ طبیب آپ کے بدن کے بارے میں اور مکینک آپ کی کار کے بارے میں آپ سے زیادہ علم رکھتا ہے حالانکہ وہ آپ کی نسبت ان کے ساتھ آپ سے زیادہ لگاؤ نہیں رکھتا۔ چنانچہ ہمیں لازم ہے کہ زندگی کے لیے کوئی

راستہ اختیار کرنے میں اپنے آپ کو خدا کی راہ اور نبیوں کے طرزِ فکر کے سپرد کر دیں، اس لیے کہ خدا ہمارے متعلق خود ہم سے بھی زیادہ واقف اور مہربان ہے۔ بقول قرآن: کیا وہ لوگ اب بھی جاہلیت کے زمانے کا سا فیصلہ چاہتے ہیں، حالانکہ خدا سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی ہے ہی نہیں۔ (سورۂ مائدہ۔آیت ۵۰)

خدا ہم سے زیادہ واقف ہے کیونکہ اس نے ہمیں بنایا ہے اور ہر چیز کا بنانے والا اپنی بنائی ہوئی چیز کی پوری اور کافی معلومات رکھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: کیا وہ جس نے پیدا کیا نہیں جانتا ہے؟ (سورۂ ملک۔آیت ۱۴)

شہید نواب صفوی سے ایک عمدہ مثال نقل کی جاتی ہے۔ وہ کہتے تھے آپ جو چیز جس کارخانے سے خریدتے ہیں، ضروری ہے کہ وہی انجینئر جس نے اسے تیار کیا ہے اس چیز کے استعمال کا طریقہ بتائے۔ اس میں دوسروں کو حکم جاری کرنے کا حق نہیں ہے۔ انسان کی حیثیت بھی کسی کارخانے کی مصنوعات سے کم نہیں ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے لیے بھی خدا ہی قانون بنائے جو اس کا بنانے والا ہے۔ اس کی تمام مادی اور روحانی ضروریات سے آگاہ ہے اور اس کے آئندہ اور ہمیشہ کے راستے سے باخبر بھی ہے۔

ضروری ہے کہ انسان اپنی زندگی کے لیے ایک راستہ منتخب کرے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ یہ راستہ کس طرح معلوم کرے:

۱) اپنی سمجھ یا ذاتی رجحانات کے مطابق کوئی راہ اختیار کرے۔
۲) اپنے لیے دوسروں کی راہ کا انتخاب کرے۔
۳) اس راہ پر چلے جو انبیاءؑ خدا کی طرف سے لیکر آئے ہیں۔

اگر ہم اس معاملے پر تھوڑا سا غور کریں تو وہ اس تیسری راہ کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کیونکہ ہمارا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ہم نے کتنی ہی بار راہ کا انتخاب کیا ہے اور بعد میں ہمیں اپنی غلطی کا پتا لگا تو ہم نے راہ بدل لی۔

واحد راستہ وہی رہ جاتا ہے جو خدا کے لامحدود علم کے سرچشمے سے وحی کے ذریعے اور معصوم پیغمبروں کے واسطے سے ہمارے لیے کھولا جاتا ہے ۔کیا ہم نبیوں کی پکار سے بے پرواہ رہ سکتے ہیں؟

ہمیں بہت سی دلیلیں نبیوں کی تلاش میں لے جاتی ہیں جن کی ایک مثال ہم اس جگہ نقل کرتے ہیں۔

۱) طولِ تاریخ میں پیغمبروں نے بڑے انقلابات برپا کیے اور منزل شہادت تک بڑھتے چلے گئے ۔ان مقدس ہستیوں کے کارہائے نمایاں دوست، دشمن سب پر اس طرح آشکار تھے کہ دشمنوں نے بھی کبھی ان کو گناہ اور غلطی سے نسبت نہیں دی ۔انہوں نے اپنے نظریے کے حق میں بہت سے واضح دلائل پیش کیے، معجزے دکھائے اور اپنے سچے پیروکار بھی پیدا کیے ۔اگر ہم نبیوں کی ان تمام تحریکات کو احساس ذمہ داری اور عذابِ الٰہی سے خوف پر مبنی قرار دیں، تو بھی ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم اپنی راہ بدل دیں اور نبیوں کا راستہ اختیار کرلیں کیونکہ ہم طالب علموں کے قول کے مطابق امکانی نقصان کا دور کرنا ضروری ہے۔

۲) ہمیشہ سے لوگ یہ کہتے آئے ہیں کہ ہم بے ادبوں سے ادب سیکھیں اور انہوں نے جو کچھ کیا ہے ہم اس کے خلاف کریں۔ یہاں اگر ہم انبیاءؑ کے دشمنوں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ پرانے زمانے میں ابولہب، ابوجہل اور سفیان مخالف تھے اور آج بڑی طاقتیں انبیاءؑ کی راہ کی بہت سخت مخالف ہیں۔ہم ان شیطانی قوتوں کی مخالفت سے انبیاءؑ کے راستے کی سچائی کا سراغ پاتے ہیں۔

۳) تیسری بات جو انبیاءؑ کے راستے پر چلنا ہمارے لیے ضروری قرار دیتی ہے، یہ ہے کہ خوبی اور اچھائی کی قدردانی کا جذبہ انسان کی فطرت میں چھپا ہوا ہے لہٰذا اگر انسان خدا کی نعمتوں پر نظر ڈالے اور یہ احساس کرے کہ اس نے مادی اور روحانی نعمتوں کے سمندر میں غوطہ لگایا ہے تو وہ فوراً یہ احساس کرے گا کہ ایسی راہ پر چلنا چاہیے جو ان تمام نعمتوں کے مالک نے مقرر کی ہے۔

انبیاءؑ کا راستہ انسان کی پرانی خواہش ہے

انسان فطری طور پر اس قانون کی حمایت کرتا ہے جو مکمل طور پر منصفانہ ہو وہ ایسی حکومت کا شیدائی ہے جو کسی خاص طبقے کی قائم کی ہوئی نہ ہو اور وہ ایسے رہبر کی طرف جھکتا ہے جس میں کسی قسم کی خودغرضی اور برتری کی خواہش نہ ہو اور جو نہایت سادہ زندگی بسر کرتا ہو۔ برابری، سادگی، سچائی ،نیکی اور انصاف پسندی ہر انسان کی فطری خواہش ہے۔ تاریخی شہادتوں کے مطابق اس قسم کی حکومت اور ایسے رہنما کی روشن مثال صرف انبیاءؑ اور ان کے منصفانہ نظام میں اور ان لوگوں کی ذات میں دیکھی گئی ہے جو نبیوں سے نظریاتی طور پر زیادہ قریب ہیں۔ انسان کی اس فطری خواہش کی مناسب تکمیل صرف انبیاءؑ کی سنت کے سائے میں ہو پاتی ہے۔ اس بات کی دلیل حکومت کے موجودہ نظام اور رہبر ہیں جو دنیا کے ہر خطے میں صدیوں سے غریبوں کا خون چوس رہے ہیں اور ان تمام قانون دانوں اور سیاست کاروں نے غریبوں کے کسی دکھ کا مداوا نہیں کیا ہے، بلکہ یہ تو ابھی تک نسل پرستی، بت پرستی اور ستم کاری جیسی لغویات کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔

کون سا شخص کس ذریعے سے قانون سازی کا حق رکھتا ہے۔ ہم نے یہ بھی جان لیا ہے کہ ایک قانون ساز میں مندرجہ ذیل خصوصیات ہونا چاہئیں:

۱) مکمل اور لامحدود علم اور انسان کی ظاہری اور باطنی ضروریات اور مسائل پر اسے پورا پورا عبور حاصل ہو۔

۲) انسان کے لیے لطف اور شفقت رکھتا ہو۔

۳) پورا پورا انصاف کرنے والا ہو اور کسی ایک فرد یا گروہ کے مفادات کو مصلحت اور حقیقت پر ترجیح نہ دیتا ہو۔

۴) خود کوئی غرض اور حاجت نہ رکھتا ہو۔

ظاہر ہے کہ ایسا قانون ساز سوائے خدا کے اور کوئی نہیں ہے جس کے پیغامات، ہدایات اور قوانین نبیوں کی معرفت انسان تک پہنچتے ہیں۔ ہاں پیغمبر پیغام حاصل کرنے والے آلات کی

طرح ہیں جو انسانی جسموں میں نصب کر دیے گئے ہیں۔

ہم لوگوں سے قانون کیسے منوائیں؟

ہر قانون لوگوں میں ایک خاص طریقے سے رواج پاتا ہے۔ ہم مختصر طور پر وہ طریقے بیان کرتے ہیں:

۱) جہالت اور حماقت کے طریقے سے: کبھی لوگ محض ناواقفیت اور بے عقلی کی وجہ سے کوئی حکم مان لیتے ہیں جیسے کہ علامہ اقبالؔ فرماتے ہیں:

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہری داشت ولی نذر قباد و جم کرد
یعنی در خوئی غلامی ز سگاں خوار تر است
مند ندیدم کہ سگی پیش سگی سر خم کرد

''انسان اپنی ناسمجھی کی وجہ سے اپنے ہی جیسے انسان کا غلام بن گیا۔ وہ (عزتِ نفس کا) گوہر رکھتا تھا لیکن اسے قباد و جم یعنی جابر بادشاہوں کے قدموں میں ڈال دیا۔ گویا کہ غلامی کی خصلت اختیار کر کے وہ کتوں سے بھی بدتر ہو گیا ہے کیونکہ میں نے ایک کتے کو دوسرے کتے کے سامنے اپنا سر جھکاتے کبھی نہیں دیکھا۔''

اسلام اندھا دھند تقلید کو نہیں مانتا اور بہت سی قرآنی آیتوں میں بت پرستوں کے طور طریقے پر نہایت سختی سے اعتراض کرتا ہے جو اپنے غلط عمل کا سبب اپنے بزرگوں کی تقلید بتاتے ہیں مثلاً: جب وہ کوئی برا کام کرتے تھے تو ان کی دلیل صرف یہ ہوتی تھی کہ ہمارے بزرگ بھی یہی کام کرتے تھے۔ (سورۂ انبیاءؑ۔ آیت ۵۳)

۲) خوف اور لالچ: ظالم صرف مرعوب کر کے اور ڈرا دھمکا کر لوگوں کو اپنا غلام بناتے ہیں اور ان پر اپنے جابرانہ قوانین نافذ کرتے ہیں۔ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: اگر تم

میرے سوا کسی دوسرے کو اپنا معبود بناؤ گے تو میں تمہیں جیل میں ڈال دوں گا۔ (سورۂ شعراء۔ آیت ۲۹)

وہ لوگوں کو لالچ دیکر بھی اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں جس طرح فرعون نے اپنے زمانے کے جادوگروں کو جمع کیا اور ان سے وعدہ کیا کہ اگر ممکن ہو تو تم موسیٰ علیہ السلام کو رسوا کرو میں تمہیں انعام بھی دوں گا اور اپنا مقرب بھی بنالوں گا۔

ساحروں نے فرعون سے کہا: اگر ہم جیت گئے تو کیا تو ہمیں انعام دیگا؟ فرعون نے کہا: ہاں یقیناً تم میرے مقرب اور درباری بن جاؤ گے۔ (سورہ شعرا آیت ۴۱، سورۂ اعراف آیت ۱۱۳)

ظاہر ہے کہ لوگوں کو اپنے قانون کا مطیع بنانے کے لیے ڈر اور لالچ دو طاقتور وسیلے ہوتے ہیں لیکن یہ دونوں وسیلے آزادانہ اور سوچ سمجھ کر کوئی طریقۂ عمل اختیار کرنے کی قوت کو بہت زیادہ کمزور کر دیتے ہیں۔ اسلام نے اگرچہ لوگوں سے دوزخ کے عذاب اور جنت کی راحت کی بات کی ہے لیکن یہ وعدے فوری طور پر پورے ہونے والے اور اس موجودہ دنیا کے لیے نہیں ہیں اور لوگ ان وعدوں کو اپنی موت کے بعد ہونیوالی اور دور کی بات سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر وہ پورے سکون سے حکم ماننے میں اپنی راہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ بڑا فرق ہوتا ہے ان دو آدمیوں میں جن میں سے ایک کو قرض کی ادائیگی کل کرنا ہے اور دوسرے کو چند سال بعد۔ پہلے کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے ہوتے ہیں جبکہ دوسرا یوں نظر آتا ہے جیسے قرضدار ہی نہیں۔

قیامت کے دن کا خوف یا امید انسانوں کو عمل پر کسی بھی طرح سے مجبور نہیں کرتے۔ ہماری بہترین دلیل خود انسانوں کی یہ روش ہے کہ وہ خدا کے وعدوں سے باخبر ہوتے ہوئے بھی عمل میں بے حد کاہلی برتتے ہیں۔

۳) ضرورت اور مقابلہ: تیسرا سبب جو انسان کو قانون کے ماننے پر ابھار سکتا ہے وہ ضرورت اور مقابلہ ہے۔ مال کی ضرورت اور دوستوں اور دشمنوں سے مقابلہ، انسان میں کسی حد تک سعی و کوشش کے جذبے کو ابھار سکتا ہے۔

۴) عقل اور تمیز بھی قانون کو ماننے کے اسباب میں سے ہیں: اگر پولیس ڈرائیوروں کے لیے

کوئی راستہ بند کردے اور انہیں اس کی وجہ معلوم ہوجائے تو وہ بے عذر مان جائیں گے اور اگر انہیں اس کی وجہ (چاہے مختصر طور پر ہی سہی) کا علم نہ ہو پائے اور خاص طور پر اگر انہیں پولیس کی روش میں کسی غرض مندی اور ناجائز فائدے کا شک ہوجائے تو وہ اس بندش کو ہرگز نہیں مانیں گے۔

اسلام بھی لوگوں کو قانون کے ماننے پر تیار کرنے کے لیے عام طور پر عقل و تمیز ہی کا ذریعہ اختیار کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ کبھی وہ مختصراً کہتا ہے کہ فلاں کام کرو تا کہ تم میں تقویٰ کی روح پیدا ہو، مثلاً روزے کے حکم میں کہتا ہے: اے ایمان لانے والو! تم پر روزہ واجب کر دیا گیا ہے جس طرح پچھلی اُمتوں پر واجب کیا گیا تھا اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۸۳) وہ اس فرض کا مقصد باطنی ترقی بتاتا ہے یا خیرات کرنے والوں کے بارے میں کہتا ہے: خیرات دینا ایک ایسا تعمیری عمل ہے جو خود تمہاری روح میں اعلیٰ قوتیں پیدا کرتا ہے۔ (سورۂ بقرہ آیت۔ ۲۶۵)

ہمارے معصوم پیشواؤں کی روایتوں میں بھی اسلام کے بہت سے احکام کے اسباب اور دلائل اس طرح بیان کیے گئے ہیں اور اس بارے میں بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں (علل الشرائع)۔ یہ بڑی خوش نصیبی کی بات ہے کہ روز بروز ہونیوالی ترقی نت نئے حقائق سامنے لاتی ہے اور احکام کا فلسفہ آشکار کرتی ہے۔ (۱)

۵) عشق اور محبت: اس سلسلے میں عشق و محبت کو پانچواں سبب قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ ہم جس سے محبت رکھتے ہیں اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں چاہے یہ محبت بیجا ہی کیوں نہ ہو۔ پھر اس عشق و محبت کا تو کہنا ہی کیا جو علم و معرفت کے ساتھ ساتھ عقل اور فہم کی بنیاد پر قائم ہو:

''جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ خدا سے بے حد محبت اور قلبی تعلق رکھتے ہیں۔''

(سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۵)

(۱) اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ ہم جس حکم کی دلیل سے واقف نہ ہوں اس پر عمل نہ کریں۔

یہ تھے وہ راستے جن سے لوگ کسی قانون کو قبول کرتے ہیں اور اس بات کو دہرانے کی تو ضرورت ہی نہیں ہے کہ سب سے اچھا، سب سے درست اور سب سے مناسب وہی چوتھا اور پانچواں طریقہ ہے۔

علم وفہم کا طریقہ اور عشق ومحبت کا طریقہ: یہ اسلام کا صاف اور واضح حکم ہے جیسا کہ وہ کہتا ہے: ''لوگوں کو حکیمانہ دلائل سے، دل لبھانے والی نصیحتوں اور اچھی بحث سے خدا اور اسلام کی طرف بلاؤ۔'' (سورۂ نحل۔آیت ۱۲۵)

قوت اور لڑائی سے آخری مرحلے میں کام لینا چاہیے۔تاہم اسلام کا عام طریقہ وہی تعلیم دینا اور عشق ومحبت پیدا کرنا ہے۔یہ قرآن ہے جو یوں فرماتا ہے: اس گھر یعنی کعبہ کے مالک کی عبادت کرنا چاہیے کیونکہ وہی تھا جس نے لوگوں کو بھوک اور خوف سے سیری اور سکون تک پہنچایا۔

(سورۂ قریش۔آیت ۴)

پیٹ بھرنے اور امن مہیا کرنے کو عبادت کی طرف پہلا قدم مانا گیا ہے تاکہ خدا کے لیے ان کی محبت اور قدردانی کے جذبے کو بیدار کرے۔

قانون کو جاری کرنے کا ضامن کون ہے؟

بہترین محرک فکر وفہم کو ترقی دینا اور حکم دینے والے سے عشق ومحبت پیدا کرنا ہے۔اب ہم قانون جاری کرنیوالے ضامن کو دوسرے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ فکری پختگی

اسلام کی طرح کسی بھی دین ومذہب میں علم حاصل کرنے اور سوچنے سمجھنے کی ترغیب نہیں دی گئی ہے۔یہ جو پرہیزگار عالموں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے یا ملک ملک کی سیر کرنے اور مشورے کو اہمیت دی گئی ہے، اس کی غرض یہ ہے کہ ہمارے فکر وفہم کی سطح بلند ہو۔پورے قرآن میں پچھلی قوموں کی تاریخ ان کے زوال کے اسباب، انبیاءؑ کی تاریخ اور ان کی کامیابی کے راز نظر آتے ہیں۔

قرآن کے بقول فلسفہ احکام کا بیان اور پچھلی ضدی امتوں کی ہلاکت کے اسباب کا بیان قوانین کے اجراء کا ایک اہم محرک اور ضامن ہوسکتا ہے۔

۲۔ جذبات سے کام لینا

انسان کو کام کی تحریک دینے والا ایک عامل اس کے جذبات سے مدد لینا ہے۔

حوصلہ افزائی کا مسئلہ قرآن میں اس حد تک پیش کیا گیا ہے کہ وہ پیغمبرؐ سے فرماتا ہے:

ان لوگوں کے لیے دعائے خیر کیجئے جو اسلامی مالیات اور زکات ادا کرتے ہیں کیونکہ یہ حوصلہ افزائی ان لوگوں کے دلی سکون کا سبب ہے۔(سورۂ توبہ۔آیت ۱۰۳)

یا کچھ آیات میں ہم پڑھتے ہیں:

رحم کی سفارش کرتے رہو(سورۂ بلد۔آیت ۱۷)اور ایک دوسرے کو حق اور ثابت قدمی کی وصیّت کرتے رہو۔(سورۂ عصر۔آیت ۳)

قرآن مجید ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے:

تم راہِ خدا میں جدال وقتال کیوں نہیں کرتے جبکہ مستضعفین مرد،عورتیں اور بچے فریاد کر رہے ہیں کہ اے خدا! ہمیں اس بستی کے ظالم باسیوں سے چھٹکارا دلا(سورۂ نساء۔آیت ۷۵)

اس آیت میں خدا نے لوگوں کی جہاد پر آمادگی اور تیاری کے لیے ان بچوں کے چہرے منعکس کر دیے ہیں جو ظالموں کے چنگل میں گرفتار ہو چکے ہیں اور لوگوں کے جذبات کو ابھارنا چاہا ہے۔

ہم ایک دوسرے مقام پر یوں پڑھتے ہیں: قحط اور سختی کے دنوں میں کسی قرابت دار یتیم کو یا کسی غریب کو جو خاک پر بیٹھا ہوا ہے کھانا کھلانا۔(سورۂ بلد۔آیت ۱۳ تا ۱۶)

یہ خیال رکھیے کہ یہ مطالب بالکل جذباتی ہیں اور جذبات کو ابھار کر لوگوں کو عمل پر آمادہ کرتے ہیں۔

۳۔ خدا اور قیامت پر ایمان

قانون کے اجراء کا تیسرا سبب جو درحقیقت تمام اسباب سے زیادہ قوی ہے خدا اور قیامت پر ایمان ہے۔اس بات پر ایمان کہ حکم خدا کا ہے اور میں اس کا بندہ اور اس کی نگرانی میں ہوں، اس کی طرف لوٹنے والا ہوں اور اس کی بارگاہِ عدل میں مجھے جواب دینا ہے نیز اس بات پر ایمان کہ وہ میرے اچھے کام کا دس گنا بدلہ دے گا اور میری غلطی سے چشم پوشی کریگا اور اس بات پر ایمان کہ ذرا برابر نیکی اور بدی کا بھی حساب ہوگا۔ہاں ایسا ایمان اور یقین اطاعت و فرمانبرداری پر بہت گہرا اثر رکھتا ہے۔

۴۔ نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا

جب قوم بے پروائی چھوڑ کر مستعد اور چوکس ہو جاتی ہے تو اس کے تمام افراد نیکی کا حکم دینے اور برائی کی ممانعت کرنے لگتے ہیں۔جس طرح ایک موٹر کار غلط سمت میں چلتی ہے تو تمام کاریں اس کے خلاف ہارن بجاتی اور بتیاں رشن کر دیتی ہیں۔اس طرح وہ اسے اس کی غلطی پر ٹوکتی ہیں اور اپنے اس عمل کو اس قدر دہراتی ہیں کہ غلط سمت میں کار چلانے والا ڈرائیور شرمندہ ہو جاتا ہے اور اس سمت کو بدل کر سیدھے طریقے سے چلنے لگتا ہے۔ہاں تو خود لوگ بھی قانون کے اجراء کے ضامن بن سکتے ہیں۔

۵۔ حکومت اور سزا

اولی عقیدے میں جبر و اکراہ کی نفی مراد ہے۔رکاوٹوں کے منصوبوں اور اس عمل میں جبر کی نفی مراد نہیں ہے جس سے دوسروں کو بھی نقصان پہنچتا ہے ورنہ ذخیرہ اندوز، سود خور اور چور سب کے سب کہہ سکتے ہیں کہ دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم خلاف ورزی کریں!

نبیوں کی پہچان

نبیوں کی پہچان کے تین طریقے ہیں:

۱۔ جب کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں اس دنیا کو پیدا کرنے والے خدا سے رابطہ رکھتا ہوں جو لامحدود علم اور قدرت کا مالک ہے تو اسے ایسا کام کرنا اور ایسی بات کہنا چاہیے جو دوسروں سے نہ ہو سکے اور اس طرح اپنے دعوے کو سچا ثابت کرے یعنی وہ ایسا کام کر دکھائے جو انسانی طاقت سے باہر ہو اور جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ واقعی دوسری دنیا سے رابطہ رکھتا ہے۔ اس عمل کو معجزہ کہتے ہیں۔

ایک سوال

انبیاءؑ کا کام موجدوں، عابدوں، جادوگروں اور پہلوانوں کے کام سے کس لحاظ سے مختلف ہے کیونکہ ان میں سے بھی ہر ایک کسی نہ کسی ایسے کام میں مہارت رکھتا ہے جو دوسروں سے نہیں ہو پاتا۔ پھر انہیں پیامبر کیوں نہیں کہا جاتا؟

جواب

ان لوگوں کا کام انبیاءؑ کے کام کے برعکس مشقی اور تکراری ہوتا ہے۔ اس مُرتاض نے جو چالیس دن تک نہیں سوتا یا کھانا نہیں کھاتا اور اسی طرح اس پہلوان نے جو بھاری پتھر ہاتھوں پر اٹھالیتا ہے، مدتوں کی مشق سے یہ قوت پیدا کر لی ہے۔ چنانچہ پہلوان نے اپنی کسرت کی ابتدا میں وہی وزن ہاتھوں پر اٹھایا جو عام آدمی بھی اٹھا سکتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ زیادہ بھاری بوجھ اٹھاتا چلا گیا یہاں تک کہ اب وہ اتنا بھاری پتھر اٹھالیتا ہے جس کے لیے کئی افراد کی قوت کے برابر قوت درکار ہوتی ہے لیکن جب لوگ حضرت صالحؑ کے گرد جمع ہو گئے اور ان سے کہنے لگے کہ آپ دنیا میں جاری اللہ کی قدرت کی مدد سے اس پہاڑ میں سے اسی وقت ان خصوصیات کی ایک اونٹنی نکال لائیں تو آپ نے یہ نہیں کہا کہ ٹھہرو پہلے میں مشق کر لوں اور کچھ عرصے کے بعد پہاڑ میں سے تمہارے لیے ایک اونٹنی نکال لاؤں گا کیونکہ ایسے عجیب وغریب کام طویل مشق سے بھی نہیں کیے جا سکتے۔

۲۔ ان لوگوں کا کام تعلیم وتربیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہر عابد اور موجد کسی استاد اور نصاب کا محتاج ہوتا ہے لیکن اس کے مقابل نبیوں کا کوئی معلم، مرشد اور استاد نہیں ہوتا۔

۳۔ ان لوگوں کا کام خصوصی مہارت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ موجد کسی ایک یا چند شعبوں میں مہارت رکھتا ہے اور اس کا کام اس کے محدود امکانات کا پابند ہوتا ہے۔ دوسری جانب انبیاءؑ طرح طرح کے مافوق الفطرت کام انجام دیتے ہیں کیونکہ ان کو یہ قوت خدا کی طرف سے حاصل ہوتی ہے اور خدا کی قدرت کسی کام کے صرف دو ایک نمونے دکھانے تک ہی محدود نہیں ہوتی۔

۴۔ ان لوگوں کا کام بیشتر مادی مقصد سے متعلق ہوتا ہے: جب جادوگر جادو کرتا ہے یا پہلوان پتھر اُٹھاتا ہے یا موجد اور مرتاض کوئی کام انجام دیتا ہے تو وہ صرف لوگوں کی توجہ حاصل کرنے یا تفریح یا بہت ہوا تو خوشگوار زندگی کے لئے انجام دیتا ہے لیکن انبیاءؑ کا مقصد انسان کو بلند کرنا، سماج کو مثالی بنانا اور ایک دوسری قوت (خدا) کی طرف ان کی رہنمائی کرنا ہوتا ہے۔

۵۔ ان لوگوں سے غلط کار کردگی بھی ممکن ہے لیکن انبیاءؑ معصوم ہوتے ہیں اور ان کی باعزت زندگی میں کسی قسم کی خامی نہیں ملتی۔

۶۔ جادوگر، مرتاض اور موجد کبھی یہ نہیں کہتے کہ دوسرے لوگ یہ کام نہیں کرسکیں گے۔ ان میں سے کسی کو چیلنج کرنے کی ہمت نہیں ہوئی لیکن پیغمبر جو کام کرتے ہیں وہ پوری دلیری اور دل جمعی سے اعلان کردیتے ہیں کہ دوسرے ایسا کام انجام نہیں دے سکتے۔

اس لیے انبیاءؑ کے معجزے اور دوسروں کے نظر فریب کاموں میں کام کی قسم، مقصد اور انجام دینے والے کی شخصیت کے لحاظ سے بھی بہت اختلاف ہوتا ہے کہ اگر انسان ذرا سی بھی توجہ کرے تو پیغمبروں کو جادوگروں، مرتاضوں اور موجدوں سے الگ پہچان لے گا۔

معجزہ تماشا نہیں ہے

لوگ جس قسم کا معجزہ طلب کرتے تھے کیا انبیاءؑ وہ دکھادیا کرتے تھے؟

اس کا جواب نفی میں ہے کیونکہ ہم قرآنی آیات میں پڑھتے ہیں کہ لوگ کبھی کبھی پیغمبروں

سے ناممکن یا غیر متعلق یا ضرر رساں یا دنیا کے نظام کے خلاف کاموں کی امید بھی کرتے تھے اور وہ محترم ہستیاں ان کی ایسی امیدوں پر توجہ نہیں دیتی تھیں۔ان کے اس قسم کے بیجا مطالبوں کی کچھ مثالیں یہ ہیں:

۱۔ وہ کہتے تھے کہ خدا کو ہمارے پاس لے آؤ۔(سورۂ بنی اسرائیل)
اس لحاظ سے کہ خدا جسم نہیں رکھتا ان کی یہ امید پوری کرنا ناممکن تھا۔

۲۔ وہ کہتے تھے کہ نظامِ شمسی کو درہم برہم کر کے اور آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے سروں پر گرادو۔(سورۂ بنی اسرائیل۔آیت ۹۲)

۳۔ وہ کہتے تھے کہ یا تو تمہارا گھر سونے کا ہو۔(سورۂ بنی اسرائیل۔آیت ۹۳)

۴۔ یا تمہارا باغ انگوروں اور کھجوروں کا ہو۔(سورۂ بنی اسرائیل۔آیت ۹۱)

کیا انگو اور کھجور کے ایک باغ کا مالک ہونا یا ایسے گھر کا مالک ہونا جو سونے کا ہو خدا سے رابطہ رکھنے کا ثبوت ہے؟ کیا فرعون، قارون اور نمرود جو کثیر مال اور دولت رکھتے تھے خدا سے رابطہ رکھتے تھے؟ کیا پیغمبروں نے کوئی تماشا گاہ قائم کر رکھی تھی کہ وہاں تیری میری خواہش کے مطابق معجزوں کے نام سے تماشا دکھاتے رہیں۔کیا معجزہ دکھانا صرف نبوت ثابت کرنے کے لیے نہیں ہے؟

اس سے قطع نظر، کیا انہوں نے انبیاءؑ کے معجزے دیکھ کر یہ نہیں کہا تھا کہ انہوں نے جادو کیا ہے؟ جو شخص ماننا ہی نہ چاہے اور ہٹ دھرمی سے ہی کام لیتا رہے تو لاکھوں دلیلیں اور نشانیاں بھی اسے مطمئن نہیں کر سکیں گی۔

معجزے کی اصلیت

مثل مشہور ہے کہ سونے کی سار سنار جانے۔واقعی اگر یہ طے ہو جائے کہ راجوں یا بڑھیوں یا درزیوں کو کوئی معجزہ دکھائے تو معجزہ اسی شعبے میں ہونا چاہیے جو ان کے کام، سوچ، دلچسپی سے تعلق رکھتا ہو۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام موجود تھے جادو اور نیرنگ

ترقی پر تھا اس لیے ان کا معجزہ بھی لاٹھی کا سانپ بن جانا اور ہاتھ کا روشن ہو جانا تھا یا جس عہد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے طب اور بیماریوں کے علاج سے لوگوں کو زیادہ دلچسپی تھی۔ چنانچہ آپ خدا کے حکم سے مردے کو زندہ کر دیتے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں زبان و بیان، عزت اور فضیلت کا معیار تھا اس لیے ان کا بڑا معجزہ بھی قرآن ہی طے پایا۔ دوسری طرف اسلام جیسا ہمیشہ رہنے والا مذہب بھی دائمی معجزے کا محتاج ہے اور قرآن، پیغمبر اسلامؐ کا ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے۔

قرآن کی خصوصیات

۱۔ پیغمبرؐ اسلام کا معجزہ (قرآن) لوگوں کے ہاتھوں میں ہر وقت موجود ہے اس کے برعکس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی یا وہ مردے جنہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے زندہ کر دیا تھا، دوسرے زمانوں یا دوسرے مقاموں کے لوگوں کے مشاہدے میں نہیں آ سکتے۔

۲۔ پیغمبر اسلامؐ کے معجزے کے اجزاء وہ حروف ہیں جن کی مدد سے سب لوگ روزانہ بات چیت کرتے ہیں۔

۳۔ قرآن معجزہ بھی ہے اور خدا کا حکم بھی جبکہ دوسرے نبیوں کے معجزے ایسے نہیں تھے۔

۴۔ دوسرے نبیوں کے معجزے ایک لحاظ سے معجزے تھے لیکن قرآن علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ کے قول کے مطابق پندرہ طریقوں سے اور علامہ طباطبائی علیہ الرحمۃ کے قول کے مطابق گیارہ طریقوں سے معجزہ ہے۔

خدا نے اپنی اس عظیم کتاب میں مخالفوں کو بار بار دعوت دی ہے کہ اس سرکشی، تخریب کاری، روپے کے صرف، جانوروں کے نقصان، لڑائیاں لڑنے، یتیم بنانے، افواہیں پھیلانے، رعب ڈالنے اور الزام لگانے کے بجائے تم سب باہم مل جاؤ اور اس قرآن جیسی کتاب لے آؤ (اے رسولؐ!) کہہ دو کہ اگر تمام انسان اور جن جمع ہو جائیں تو بھی اس قرآن جیسی کوئی کتاب قطعاً پیش نہیں کر سکتے چاہے ان میں سے بعض دوسروں کے مددگار بن جائیں۔ (سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۸۸)

ان مخالفوں سے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن تمہارا گھڑا ہوا ہے کہہ دو کہ تم بھی اس قرآن جیسی دس سورتیں لے آؤ۔(سورۂ ہود۔آیت ۱۳)

دوسری جگہ ہم پڑھتے ہیں: کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو پھر قرآن کی سی ایک ہی سورہ لے آؤ اور جس غیر خدا کی قدرت سے چاہو مدد لے لو۔(سورۂ یونس۔آیت ۳۸)

محترم قارئین! ان تین آیتوں پر غور کریں کہ خدا نے کتنی بار رعایت دی ہے اور ہر بار لوگوں کو چیلنج کیا ہے کہ قرآن کا مثل لے آؤ۔

ہم چودہ صدری سے جواب کے منتظر ہیں

واقعی اس قدر رعایت، اتنی تحریک، اتنے دشمنوں کے باوجود کوئی جواب کیوں نہیں دیتا!

عربی ہماری مادری زبان نہیں ہے جو ہم قرآن کا مثل پیش کریں۔عربی زبان والے کیوں خاموش ہیں؟ ہم اسلام کے دوست ہیں دُشمن کیوں نہیں بولتے ؟اس وقت بھی ہزاروں عربی بولنے والے سوشلسٹ اور اسلام کے سرکش مخالف عرب ممالک میں بھی اور غیر عرب ممالک میں بھی موجود ہیں اور ہر سال اپنے ملکی بجٹ کا لاکھوں روپیہ اپنے نظریے کی اشاعت یا اسلام کے خلاف سازشیں کرنے پر خرچ کرتے ہیں نیز بین الاقوامی رابطے سے بھی جس کا دامن بہت وسیع ہے تھوڑے ہی عرصے میں تمام دانشوروں اور مفکروں کو ایک سیمینار (مذاکرے) میں جمع کر سکتے ہیں اور قرآنی گفتگو کے مثل ایک بات بنا سکتے ہیں لیکن نہیں بنا پائے ہیں!

قرآن مجید میں ایسی آیتیں نظر آتی ہیں جو نازل ہونے کے وقت سراسر پیشین گوئیاں اور غیبی خبریں تھیں لیکن زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ حقائق کی صورت میں سامنے آگئیں۔

جس زمانے میں کچھ لوگ اپنے حساب سے یہ سمجھ رہے تھے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کوئی بیٹا نہیں ہے اس لیے ان کی وفات کے ساتھ ہی اسلام کی بات ختم ہو جائے گی اور خود ان کے نام ان کے بیٹوں کی بدولت باقی رہ جائیں گے، عین اسی زمانے میں یہ آیت نازل ہوئی:

اے محمدؐ! ہم نے آپ کو خیر کثیر عطا کی (یعنی ہم آپ کی ایک بیٹی سے آپ کی نسل کو باقی

رکھیں گے) اور تمہارے دشمنوں کی نسل بہت بیٹوں کے باوجود ختم ہو جائے گی۔ (سورۂ کوثر)

اور ہم نے دیکھا کہ زمانے کی رفتار نے اس قول کو صحیح ثابت کر دیا۔ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ: ہم آپ کی ہنسی اڑانے والوں کے مقابلے میں کافی ہیں۔ (سورۂ حجر۔ آیت ۹۵)

کیا کوئی یقین کر سکتا تھا کہ اس سخت ہزیمت کے بعد جو روم نے اٹھائی مستقبل قریب میں اس کی تلافی ہو جائے گی لیکن آیت نازل ہوئی کہ روم شکست کھائے گا لیکن دس سال سے بھی کم مدت میں اس کی یہ ہار، جیت میں بدل جائے گی:

''روم نے شکست کھائی لیکن اس کے بعد وہ غلبہ پالے گا۔'' (سورہ روم۔ آیت ۱)

یہ آیات اپنے نزول کے وقت پیشگوئی کا انداز رکھتی تھیں۔ یہ سب اعجاز کے نشانات ہیں اور ان موضوعات کی تفصیل بڑی کتابوں میں مذکور ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہر عام انسان کام کی ابتدا میں کم تجربہ رکھتا ہے۔ اس کے اعمال پختہ اور مکمل نہیں ہوتے اور رفتہ رفتہ ترقی اور تکمیل پاتے ہیں۔ لیکن قرآنی آیات ایسی نہیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ آیات جو پیغمبری کے آغاز اور چالیس سال کی عمر میں پیغمبر سے سنی گئی تھیں، ان آیتوں سے جو آپ نے تریسٹھ سال کی عمر میں تلاوت فرمائیں غرض و غایت اور معنی میں باہم اختلاف رکھتی ہوں۔ ان کا ڈھنگ یا پہلو بدل گیا ہو یا معنی میں ترمیم ہو گئی ہو یا مہارت بیان میں اضافہ ہو گیا ہو۔ یہ سب باتیں قرآن کے خدا کا کلام اور معجزہ ہونے کا ثبوت ہیں۔ قرآن یہ حقیقت بیان کرتا ہے: ''اگر قرآن غیر خدا کا کلام ہوتا تو لوگ اس میں بہت سے اختلافات پاتے۔'' (سورہ نساء۔ آیت ۸۲)

قرآن کی حقیقت

قرآن ایسی کتاب ہے جو اپنی تربیت کی روش بھی خود متعین کرتی ہے اور پیغمبر اسلامؐ(۱)، حضرت ابراہیم علیہ السلام (۲) اور فرعون کی زوجہ آسیہ جیسی ہستیوں کو نمونے اور آئیڈیل بنا کر پیش

(۱) تمہارے لیے خدا کا پیغمبر عمدہ نمونہ ہے۔ (سورۂ احزاب، آیت ۲۱)

(۲) تمہارے لیے ابراہیمؑ بھی عمدہ نمونہ ہے۔ (سورۂ ممتحنہ۔ آیت ۴)

بھی کرتی ہے۔

بے شک اس کلامِ خدا کی تاثیر صرف ان لوگوں کے واسطے ہے جنہوں نے اپنی روح بے جا تعصب، خود پسندی، خودغرضی، غرور، ضد، تکبّر، کرپٹ اور دوسری ناجائز باتوں سے پاک کرلی ہے اور جو قرآن کے کہنے کے مطابق پرہیزگار اور سچائی کے عاشق ہیں کیونکہ قرآن کی آیتیں اس بارش کی طرح ہیں جو باغ پر پڑتی ہے تو خوشبو بڑھاتی ہے اور گندی جگہوں پر پڑتی ہے تو ان کی بدبو میں اضافہ کردیتی ہے۔

قرآن دوسری علمی کتابوں کی طرح نہیں ہے جو صرف ذہن ہی سے سروکار رکھے بلکہ یہ علمی کتاب ہونے سے کچھ زیادہ تربیت اخلاق کی کتاب ہے۔اس کے قصے تفریح کے لیے نہیں عبرت کے لیے ہیں۔اس کی تاریخ پچھلی قوموں کی روداد نہیں بلکہ قوموں کے عروج وزوال کا فلسفہ ہے۔

قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو آسان ہے، واضح ہے اور مؤثر بھی ہے۔قرآن ایک ایسا رہنما ہے جو انسان کو خاک سے خدا تک پہنچا دیتا ہے اور مادے سے روح تک بلند کردیتا ہے۔قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو پکی دلیلوں سے انسان کو بصیرت بخشتی ہے، نبیوں اور قوموں کی تاریخ بیان کرکے انسان کو راستہ دکھاتی ہے اور مثالی نمونوں، سزاؤں اور انعاموں کے بیان سے انسان کو تحریک دیتی ہے۔

اس کتاب میں انسان اور خدا کے درمیانی رابطے (عبادات) کا بھی بیان ہے، انسان اور خلق خدا کے درمیان رابطے کے مختلف پہلوؤں، خیرات، ایثار اور تعاون وغیرہ کا ذکر بھی ہے اور انسان اور نیچر کے باہمی تعلق (یعنی فطرت کی تسخیر کرنے، فطری اصولوں کو زندہ رکھنے، فطری مواد کو ترقی دینے، اس سے صحیح فائدہ اٹھانے اور مزید مواقع کی تلاش وجستجو جاری رکھنے نیز تمام فطری مظاہر کو خدا کی نشانی اور اس کی قدرت کی دلیل سمجھنے) کا بیان بھی ہے۔

اس کتاب میں مخالفوں اور منافقوں سے انسان کے معاملے کی نوعیت کا بیان بھی ہے۔ دانائی، وعظ اور اچھی بحث کے ذریعے حق کی طرف بلانا، محروم طبقے کے لیے مفسدوں اور ان

لوگوں کو ختم کرنا جو حق کو قبول کرنے میں راستے کے کانٹے کی طرح مزاحم ہیں اور سماج کے باغیوں سے شدید مقابلہ اور منافقوں کے مقابلے میں منفی و مثبت اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

قرآن میں علم کی اہمیت، اپنی ذات کی تعمیر، سماج کی تشکیل، مربی کی صفات، تربیت کا فلسفہ، تربیت کا طریقہ اور بعض دوسرے مسائل پیش کیے گئے ہیں، جیسے:

۱۔ ہم کیا سیکھیں؟

۲۔ کہاں سے سیکھیں؟

۳۔ کس لیے سیکھیں؟

اس آسمانی کتاب میں لوگوں سے ملنے جلنے کا طریقہ، مختلف توہمات کے خلاف جنگ، سیاسی، اقتصادی اور فوجی معاہدوں کا مسئلہ، کنبے کے حقوق، میاں بیوی یا اولاد اور والدین کے باہمی لحاظ اور رعایت وغیرہ کا واضح بیان ملتا ہے۔

یہ آسمانی کتاب باصلاحیت لوگوں میں ایسا یقین اور بصیرت پیدا کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس دنیا میں ہر وقت عالم اور دانا خدا کی سرپرستی میں پاتے ہیں لیکن آجکل ہماری غفلت کی وجہ سے انسان کی تعمیر کرنے اور اسے نجات دلانے والی اس کتاب کا یہ حال ہو گیا ہے کہ اس سے صرف رسمی اور نمائشی طور پر ہی استفادہ کیا جاتا ہے۔

اگر ہمارا نوجوان مدرسے میں روزانہ یہ پڑھتا کہ: اپنے دشمنوں کو اپنا سرپرست نہ بناؤ (سورۂ مائدہ۔آیت ۵۱)، اور ہماری تعلیم طلبہ کو یہ آیت سکھاتی اور اس پر عمل کیا جاتا تو استعمار کبھی ہمارے اندر نہ آ گھستا۔اگر صبح کی فوجی مشقوں (پریڈوں) میں روزانہ یہ آیت پڑھی جاتی کہ: اے مسلمانوں! غیروں کو اپنا ہمراز نہ بناؤ (سورۂ آلِ عمران۔آیت ۱۱۸)

تو مسلمانوں کی فوج کبھی برسوں تک غیر ملکی فوجی مشیروں کی احسان مند نہ ہوتی، اس قانون پر عمل کرنے سے کہ ''سود مطلق حرام ہے۔'' (سورۂ بقرہ۔آیت ۲۷۵)

سودخوری کے تمام مراکز بند ہو جاتے اور اس حکم سے کہ ''جو فرقہ زیادتی کرے تم بھی اس

سے لڑو‘‘ (سورۂ حجرات ۔آیت ۹) تمام اسلامی ممالک اپنی فوجی طاقت کو منظم کرتے اور حملہ آوروں کو عملی جواب دیتے تو اسلامی دنیا جو روئے زمین کی پوری آبادی کا تقریباً ایک تہائی ہے اپنی حقیقی عزت حاصل کر لیتی ۔اگر تمام مسلمان اس قرآن کی آواز کو دل و جان سے قبول کر لیتے جو یہ کہتا ہے کہ قوموں کی نحوست اور ہلاکت کا سبب ظالموں کی پیروی ہے۔(سورۂ ہود۔آیت ۵۹) تو ان حاکموں کو جنہیں بڑی طاقتوں نے اپنے ہاتھوں سے بٹھایا ہے، اپنے سے دور کر دیتے اور قرآن کی آواز پر لبیک کہتے جو کہتا ہے کہ مفسدوں (سورۂ اعراف ۔آیت ۱۴۴)، مسرفوں (سورۂ شعراء۔آیت ۱۵۱)، گنہگاروں (سورۂ انسان ۔آیت ۲۴)، جاہلوں (سورۂ جاثیہ آیت ۱۸) اور سطحی علم رکھنے والوں (سورۂ علم ۔آیت ۱۰) کی پیروی نہ کرو۔

تلاوتِ قرآن کے آداب

۱۔ آیت: پاک لوگوں کے علاوہ کوئی قرآن کو نہ چھوئے (سورۂ واقعہ، آیت ۷۹) کے مطابق انسان کو اس آسمانی مصحف کی تلاوت کرنے سے پہلے وضو کر لینا چاہیے۔

۲۔ اسے شروع کرنے سے پہلے ہمیں شیطان کے شر، شیطانی وسوسوں، شیطانی فیصلوں اور تاویلوں سے خدا کی پناہ طلب کرنا چاہیے جو ان احکام کے اثرات کو آدمی کی روح کی گہرائی میں اترنے سے روک دیتی ہیں۔(سورۂ نحل ۔آیت ۹۸)

۳۔ قرآن پڑھتے وقت ہمیں یہ سمجھنا چاہیے جیسے خدا براہِ راست ہم سے اسی وقت اور اسی جگہ ہم کلام ہے اور ہم اس کے مخاطب ہیں۔یہ کام صرف برکت پانے یا ازبر کرنے یا تقریر میں گرمی پیدا کرنے کے لیے نہیں ہونا چاہیے۔

۴۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ قرآن کو صحیح ادائیگی اور خوش الحانی کیساتھ (سورہ مزمل۔ آیت ۴) پڑھیں یعنی حروف کو واضح طور پر ادا کریں، اوقات کا خیال رکھیں اور جلدی جلدی نہ پڑھیں۔

۵۔ قرآن پڑھنے کے بعد اس کی آیتوں پر غور کریں کیونکہ قرآن نے ان لوگوں پر سخت اعتراض کیا ہے جو قرآن پڑھتے میں صرف ہونٹ ہلاتے ہیں اور ترنم سے کام لیتے ہیں لیکن غور نہیں کرتے اور اس کے معنی کا کھوج نہیں لگاتے۔ (سورہ نساء۔ آیت ۸۲)

۶۔ قرآن پڑھنے کے ساتھ ساتھ ان روایات پر جو معصوم پیشواؤں کی طرف سے ہر آیت کے متعلق چلی آرہی ہیں نیز ہر آیت کے مضمون اور اس کے شانِ نزول پر بھی پوری توجہ ہونا چاہیے تاکہ ہمارے خیال اور عقیدے میں کجی نہ آئے اور ہم کوئی غلط مطلب نہ اخذ کر بیٹھیں چاہے وہ قدامت پرستانہ ہو یا ترقی پسندانہ۔

انبیاءؑ کی پہچان کا دوسرا طریقہ

پیغمبروں کو حالات، ان کے اقوال، کارناموں اور قرینوں پر غور کر کے بھی پہچان سکتے ہیں۔

جیسے پوچھ گچھ کرنے والا حالات کی تفتیش اور ترتیب کے بعد واقعے کی حقیقت کا بخوبی پتا لگا لیتا ہے۔ ہم بھی اس طریقے سے اپنے پیغمبر کو پہچان سکتے ہیں۔

پیغمبروں بالخصوص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ ہمارے مندرجہ بالا سوالات کا ہمیں واضح جواب دیتی ہے:

کون تھے؟	بے پڑھے بھی تھے اور امانتدار بھی تھے۔
کہاں تھے؟	بت پرستی، شرک اور تفرقے کے مرکز میں تھے اور انہوں نے توہمات اور جہالت کے طوفان میں دشواریوں بھری تحریک شروع کی۔
ان کے گرد کیسے لوگ تھے؟	خدیجہؑ جیسی عورت اور علی ابن ابی طالبؑ سا مرد، فضیلت، خلوص اور پاکیزگی کے دو نمونے تھے جو ایمان سے پہلے بھی بزرگی کے آثار رکھتے تھے۔
ان کے مخالف کون تھے؟	ان کے مخالف بڑے طاقتور، خود غرض، مغرور اور استحصال کرنے والے ظالم لوگ تھے۔

وہ کس طریقے سے اپنی بات ثابت کرتے تھے؟	وہ صحیح راستے سے نہیں ہٹتے تھے اور کبھی مادی چیزوں کا وعدہ نہیں کرتے تھے اور دھوکے بازی سے انہوں نے کبھی اپنے پیغام کی تبلیغ نہیں کی۔
اصولاً ان کی بات کیا تھی؟	ان کی گفتگو قرآن مجید کے روشن احکامات تھے۔
انہوں نے کن لوگوں کی تربیت کی؟	ان کے مکتب فکر کے تربیت یافتہ سلمانؓ، ابوذرؓ، مقدادؓ جیسے لوگ تھے۔

واقعی اگر ہمارے پیغمبرؐ کے پاس کوئی معجزہ نہ بھی ہوتا تو ان کی سوانح عمری، کارنامے، مقاصد اور حالات کا مطالعہ ہی ان کی سچائی کا گواہ ہوسکتا تھا۔

تیسرا طریقہ

ہم پچھلے پیغمبروں کے اقوال کو پیغمبروں کی پہچان کا تیسرا طریقہ مان سکتے ہیں۔ اس بارے میں ایک عمدہ مثال پر غور کیجیے:

اگر میں آتا اور یہ دعویٰ کرتا کہ آپ کا گھر میری ملکیت ہے اور میرا نام پتا اس گھر کے قبالے اور دستاویز میں لکھا ہوا ہے تو اس دعوے کا فطری جواب صرف یہ ہوتا کہ آپ اپنی دستاویز پیش کرتے اور لوگوں کو دکھاتے کہ اس میں میرا نام پتہ نہیں ہے اس لیے میرا دعویٰ یکسر غلط ہے۔

پیغمبرؐ اسلام تشریف لائے اور انہوں نے فرمایا کہ میں وہی پیغمبر ہوں جس کا نام وغیرہ تمہاری توریت اور انجیل میں لکھا ہوا ہے۔

یہودیوں نے لڑائیاں لڑیں اور عیسائیوں نے مالی نقصانات برداشت کیے۔ اگر یہ باتیں پرانی کتابوں میں نہ لکھی ہوتیں تو وہ یہ کر سکتے تھے کہ آسانی سے پیغمبر اسلامؐ کے خلاف لڑائی پر اٹھ کھڑے ہوتے اور نہ صرف یہ کہ ان پر ایمان نہ لاتے بلکہ ان کو بدنام بھی کرتے اور کہتے کہ ان کا احوال توریت اور انجیل میں نہیں ہے اور یہ شخص جھوٹا ہے لیکن اسلام کے دشمنوں نے جو لڑائیاں لڑیں اور نقصانات اٹھائے ان سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشانیاں ان کتابوں میں موجود ہیں جن کو ان لوگوں نے آج خارج کر دیا ہے۔

پیغمبروں کی صفات

چونکہ تبلیغ کا بہترین نمونہ عملی تبلیغ ہے اس لیے خدا کے پیغمبروں کو عوام کی مشکلات میں حصہ دار ہونا چاہیے تا کہ وہ میدان عمل میں لوگوں کی تربیت اور ثبات قدم کا نمونہ ہوں اس لیے پیغمبروں کی زندگی لوگوں کی طرح عام زندگی ہوتی تھی اور وہ تکالیف میں ان کے شریک رہتے تھے۔تمام مشکلات کا مزہ چکھتے تھے۔دشمن کے ہاتھوں گرفتاری، بیٹے کی نالائقی، بیوی کی مخالفت، بیماری، تنگدستی، طعن وطنز جیسی باتیں اور دوسری مشکلات جو کم وبیش سبھی کو پیش آتی ہیں، ان کو بھی درپیش ہوتی تھیں۔ہم اس سلسلے میں چند آیتیں نقل کرتے ہیں:

ہم نے دوسروں کی طرح نبیوں کو بھی بیوی بچے اور وہ مسائل دیے جو فطری طور پر ان سے وابستہ ہیں۔(سورۂ رعد۔آیت ۳۸)

آپ سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھیجے تھے وہ بھی لوگوں کی طرح کھانا کھاتے اور بازار آتے جاتے تھے۔(سورۂ فرقان۔آیت ۲۰)

ہم پیغمبر اسلامؐ کی تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ آپ جس وقت اپنے اصحاب میں بیٹھتے تھے تو اپنی بزم کو دائرے کی شکل میں ترتیب دیتے تھے تا کہ لوگوں میں اونچ نیچ کا فرق نہ رہے اور آپ کے بیٹھنے کا طریقہ، لباس اور برتاؤ ایسا تھا کہ جو نو وارد مسجد میں آتا تھا وہ بیٹھے ہوئے لوگوں کو ہر چند دیکھتا تھا مگر پہچان نہیں پاتا تھا کہ ان میں سے پیغمبرؐ کون ہے۔یہ ہے رہبر کی زندگی کے بارے میں اسلامی حکومت کا نقشہ۔

پیشے کے لحاظ سے اکثر انبیاءؑ مویشی پالتے اور کھیتی باڑی کرتے اور بھیڑیں چراتے تھے۔

سفر میں کھانا پکاتے وقت پیغمبرؐ لکڑیاں جمع کرنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا کرتے تھے۔نہ صرف انبیاءؑ بلکہ ان کے مکتب فکر کے درجہ اول کے شاگرد اور ان کے جانشین بھی ایسے ہی تھے مثلاً حضرت امام سجاد علیہ السلام ایک اجنبی قافلے کے ساتھ حج کرنے جاتے ہیں تو سالار کارواں سے طے کر لیتے ہیں کہ وہ خدا کی خوشنودی کی خاطر حاجیوں کے تمام کام فخر کے ساتھ اپنے ذمہ لیے

رکھیں گے۔

ایک شخص حمام میں آتا ہے اور حضرت امام علی رضا علیہ السلام کو دیکھتا ہے لیکن وہ انہیں نہیں پہچانتا اور ان سے کہتا ہے کہ میرے جسم کو دستانے سے رگڑو۔امام علیہ السلام کسی عذر کے بغیر اطمینان سے یہ خدمت قبول کر لیتے ہیں لیکن جب وہ شخص پہچان لیتا ہے کہ یہ امام علی رضا علیہ السلام ہیں تو سخت شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے۔امامؑ فرماتے ہیں جب تک میں تمہارے جسم پر دستانہ رگڑ نہ لوں گا ہاتھ نہ روکوں گا۔

امیر المومنین امام علی علیہ السلام وقتاً فوقتاً گھر میں حضرت فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا کی مدد کیا کرتے تھے۔

انبیاء کو تنبیہ

نبیوں کو خدا سے جتنا زیادہ قرب اور عشق تھا اس کی بنا پر ان کو وقتاً فوقتاً سخت تنبیہیں بھی کی جاتی تھیں کہ اگر ایک لمحے کو بھی خدا کے حکم سے باہر ہوئے تو نہایت سخت بلاؤں میں گرفتار ہو جاؤ گے۔

اگر پیغمبر ہم سے کوئی ایسی بات منسوب کرے جو ہم نے اس سے نہیں کہی ہے تو ہم اس کو پوری قوت سے پکڑ لیں گے (اور اس کا منصب چھین لیں گے)اور اس کے بعد اس کی رگِ جاں کاٹ دیں گے۔(سورۂ حاقہ،آیت ۴۴ تا ۴۶)

اخلاص

نبیوں کی ایک خصوصیت اخلاص کا معاملہ ہے خدا کے یہ بندے کسی سے کوئی امید نہیں رکھتے تھے۔قرآن مجید سورۂ شعراء آیت ۱۰۹ سے ۱۸۰ تک حضرت نوحؑ،حضرت ہودؑ،حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت شعیبؑ کے پیغاموں کا خلاصہ بیان کرتا ہے کہ وہ سب ایک آواز ہو کر کہتے تھے کہ ہمارا اجر خدا کے ہاں ہے ہمارے پیغمبرؐ نے بھی بار بار اعلان کیا کہ میں تم لوگوں سے اس کے سوا اور کوئی معاوضہ نہیں مانگتا کہ خدا کی راہ اختیار کرو۔(سورۂ فرقان۔آیت ۵۷)اس اجرت کا

فائدہ دراصل خود لوگوں ہی کو مل جاتا ہے۔ بالکل اس استاد کی طرح جو اپنے شاگردوں سے کہتا ہے: میرے پڑھانے کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اپنا سبق خوب یاد کرنا یا تم میں سے ہر ایک، ایک ایک کلو لکڑیاں کلاس کے آتش دان میں جلانے کے لیے لے آنا۔

عصمت

نبیوں کی ایک اور خصوصیت عصمت ہے۔ عصمت کے معنی یہ ہیں کہ انسان ایمان تمیز اور یقین کامل کی بدولت ایک ایسی ذہنیت کا مالک بن جائے جو پوری آزادی اور علم کے ساتھ گناہ کے پاس نہ پھٹکے بلکہ گناہ کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔

جیسا کہ آپ خود بہت سے غلط اعمال کے سلسلے میں باعصمت ہیں یعنی آپ ان اعمال کے مرتکب ہوئے ہیں اور نہ آپ نے ان کے بارے میں سوچا ہے۔

۱۔ کیا آپ لوگوں کے سامنے کبھی الف ننگے ہو کر گئے ہیں؟

۲۔ کیا آپ نے کبھی اپنے آپ کو آگ لگائی ہے؟

۳۔ کیا کبھی آپ نے خود کو مینار کی بلندی سے گرایا ہے؟

۴۔ کیا کبھی آپ نے کسی خدا سے محبت کرنے والے کو قتل کیا ہے؟

ان تمام سوالوں کا جواب عموماً ہمارے نزدیک نفی میں ہے۔

کیونکہ ہم اس حد تک واقف ہیں کہ ان اعمال کے نفع ونقصان کو ہم نے مان لیا ہے اور یہ یقین کر لیا ہے کہ یہ مسئلہ ہمارے دماغ سے گزر کر دل تک پہنچ گیا ہے۔

واقعی اگر ہم کو یہ یقین ہو جائے اور ہم دل کی گہرائیوں سے یہ جان لیں کہ یہ طنز اور غیبت جو ہم آج کر رہے ہیں قیامت میں مجسم ہو کر کیا شکل اختیار کرے گی تو ہم کبھی غیبت کا خیال بھی نہ کریں ہمارا عیب یہ ہے کہ ہماری معلومات دماغ سے گزر کر دل میں جاگزیں نہیں ہوئی ہیں اور اس بات کا ہمیں علم ہے یقین نہیں۔

یقین کی علامت

پیغمبر خداؐ نے صبح کی نماز کے بعد لوگوں کی طرف رخ کیا تو ایک جوان کو دیکھا۔ اس کا رنگ زرد تھا، آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی تھیں اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ آپ نے حال پوچھا تو اس نوجوان نے کہا: اس وقت جو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں تو حالتِ یقین میں ہوں۔

آنحضرتؐ نے اس جوان سے یقین کی علامت پوچھی تو وہ بولا: میں قیامت کا یقین اس طرح کرتا ہوں کہ اس نے میری نیند اڑا دی ہے گویا ایک طرف جہنم اور اس کے آتشیں شعلے اور دوسری طرف جنت کی کثیر نعمتیں، عدل خداوندی کا دربار، لوگوں کا ہجوم اور اعمال کے حساب کتاب کے لیے خود اپنی حاضری بھی دیکھ رہا ہوں۔

پیغمبر خداؐ نے جب جوان کی علامتیں سنیں تو اس کا دعویٰ مان لیا۔

پھر اس نے آنحضرتؐ سے درخواست کی کہ وہ اس کے لیے راہِ خدا میں شہید ہونے کی دعا فرمائیں۔

آسمانی رہبر کے لیے عصمت کی شرط

یہ ضروری ہے کہ خدا بندوں پر اپنی حجت پوری کرے اور ان کے لیے بہانے کی گنجائش باقی نہ چھوڑے۔ یہ بات معصوم رہبروں کے سوا حاصل نہیں ہو سکتی۔

رہبری کی ذمہ داری کسی ایسے شخص کے کندھوں پر کیسے رکھی جا سکتی ہے جو خود خطا، غلطی اور گناہ سے محفوظ نہیں ہے۔

مزید برآں کیا لوگوں کی رہبری کسی گنہگار آدمی کے سپرد کر دینا انسان کی اہانت نہیں ہے؟

قرآن مجید ہم سب کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا نقل کرتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا:

اے خدا! پیشوائی اور رہبری کا منصب میرے بعد میری اولاد کو بھی عطا فرما لیکن بلا تاخیر یہ جواب آیا: خدا کا یہ عہد یعنی رہبری کا منصب ظالم اور گناہگار انسان کو نہیں مل سکے گا۔ (سورہ بقرہ

،آیت ۱۲۴)

علاوہ ازیں قرآن میں ہمیں جا بجا حکم دیا گیا ہے کہ رسولؐ کی اطاعت کرو۔ چنانچہ یہ حکم پیغمبروں کی عصمت کی دلیل ہے کیونکہ اگر پیغمبر ہر قسم کی کمزوری، گمراہی اور گناہ کے مرتکب ہوا کرتے تو چاہیے تھا کہ رسول خداؐ کی اطاعت کے بارے میں کتابِ خدا کا حکم مشروط ہوتا جس طرح والدین کی اطاعت نہایت ضروری ہونے کے باوجود مشروط ہے۔ چنانچہ وہ مقام بھی آتا ہے جب اولاد کو صاف صاف بتا دیا جاتا ہے کہ والدین کی پیروی نہ کرو:

اگر تمہارے ماں باپ کوشش کریں کہ تم کسی ایسی چیز کو میرا شریک بناؤ جس کے بارے میں تم نہیں جانتے تو ان کی اطاعت مت کرو۔ (سورۂ لقمان آیت ۱۵)

انبیاءؑ کی کچھ خصوصیات

آیات اور روایات کے مجموعے سے پیغمبروں کی صفات شمار کی جاسکتی ہیں جن کی فہرست یوں ہے:

۱۔ وہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا عالم ہو۔

۲۔ ایسی بیماریوں سے محفوظ ہو جن سے عوام نفرت کرتے ہیں۔

۳۔ قوت، صلاحیت، صبر، برداشت، حسن کارکردگی اور حسن اخلاق رکھنے اور خود اپنے کہے پر عمل کرنے والا ہو بلکہ ان صفات میں اپنے زمانے کے تمام لوگوں سے بڑھا ہوا ہو۔

۴۔ عقل کے خلاف کوئی حکم نہ دے۔

۵۔ اس سے پہلے کے پیغمبر اس کی اطلاع دے چکے ہوں۔

۶۔ انسان کو بخوبی سمجھنے والا ہو۔

۷۔ انسانوں کے تمام جذبوں، جبلتوں اور تربیت وہدایت کے طریقے سے واقف ہو۔

۸۔ سماجی حالات، سماج کی ترقی وتنزلی کے اسباب، مفید اور ضروری عاقبت اندیشی اور فرد اور سماج کی پیش رفت کے لیے سب سے آسان اور مؤثر طریقے جانتا ہو۔

۹۔ اس کی تعلیمات فطرت کے مطابق اور دیگر پیغمبروں کی تعلیم سے میل رکھتی ہوں۔

۱۰۔ خاندانی شرافت رکھنے والا اور نجیب الطرفین ہو، بھولنے اور پچھتانے والا نہ ہو، نہایت عاجزانہ قسم کی عبادت کرنے والا اور شجاعت کے سب سے بلند اور سب سے قوی مقام پر فائز ہو۔ ان اوصاف کے دسیوں نمونے سینکڑوں آیتوں اور حدیثوں سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

چند سوالوں کے جواب

سوال: کیا انبیاءؑ نے کوئی مثالی معاشرہ قائم کیا ہے؟

جواب: ہدایت کے لیے نبیوں اور آسمانی قانون کا آنا ایک ضرورت ہے اور لوگوں کا اسے ماننا ایک دوسرا فرض ہے اور ان دونوں کا حساب الگ الگ ہے۔

خدا کا مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگوں کی زبردستی ہدایت کی جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو سبھی ہدایت پا جاتے (سورۂ نحل آیت ۹) چنانچہ پیغمبر کا چلن بھی لوگوں پر زور زبردستی کرنا، ان کی آزادی چھین لینا اور ان پر حکم چلانا ہوتا درحالیکہ ایسا نہیں ہے۔ (سورۂ غاشیہ۔آیت ۲۲) خدا کو چاہیے کہ وہ لوگوں کی ہدایت کا وسیلہ مہیا کرے (سورۂ لیل۔آیت ۱۲) اور لوگوں کو بھی چاہیے کہ وہ ہدایت قبول کریں۔ اگر کچھ لوگوں نے خدا کی ہدایت نہیں مانی تو وہ اس کا سبب بھی نہ بنیں کہ دوسروں کے لیے خدا کی ہدایت قطع ہوجائے۔

ہمارے اس محترم پیغمبرؐ نے گوروں، کالوں اور مختلف قبیلوں کی ایک امت بنائی اور اس کی بنیاد خدا پر ایمان اور شرک اور طاغوت کے خلاف جنگ پر رکھی۔ انسانوں کے بیچ جو خیالی فرق تھے وہ ختم کر دیے اور اخلاق، اصلاح، عبادت، اطاعت، اتحاد، خدا کے قانون کے سامنے برابری، اسلامی بھائی چارہ، انصاف، آزادی، سچائی، اخلاص اور عزت کی سوغات لائے۔

امام علیؑ، ابوذرؓ، سلمانؓ، مقدادؓ اور میثمؓ جیسے لوگوں کو تربیت دی عقل اور فطرت کے مطابق قانون لائے اور خدائی نظام قائم کرنے کی کوشش میں اپنا اور اپنے پیاروں کا خون دینے تک سے گریز نہیں کیا۔ اب اگر ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا نے ابھی تک انبیاؑ کا طرزِ فکر نہیں اپنایا تو ہمیں اس کے

اسباب کا کہیں اور سراغ لگانا چاہیے۔اس مکتب فکری کی خامی یا رہبر کا نقص نہیں سمجھنا چاہیے۔

سوال: نبیوں کا آنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیوں ختم ہو گیا؟

جواب: جب حوض کا پانی گندہ ہو جاتا ہے تو اسے بدل دیا کرتے ہیں جب سڑک ،مکان ،لباس اور کار میں ٹوٹ پھوٹ ،خرابی اور خستگی آجاتی ہے تو اسے درست کرتے اور بناتے ہیں۔نئے پیغمبر کی ضرورت بھی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب پچھلے پیغمبر کی تعلیم تبدیل اور فراموش ہو جاتی ہے لیکن جب قرآن کا ایک حرف بھی نہیں بدلا گیا اور اسلام کی کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں ہے تو پھر کسی دوسرے پیغمبر کے آنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ہاں یہ بات دوسری آسمانی کتابوں کے برعکس ہے چنانچہ آپ اگر توریت اور انجیل پر نظر ڈالیں تو آپ ان میں اتنی غلط اور عقل کے خلاف باتیں پائیں گے کہ ان کے پڑھنے سے آپ کو شرم آئے گی۔اس پیغمبر کے آنے کی ایک دلیل آسمانی کتابوں میں تحریف اور اخفائے حقیقت ہے جس کا قرآن میں وجود نہیں ہے۔

دوسری طرف کبھی کبھی کوئی ان پڑھ آدمی یہ ارادہ کر لیتا ہے کہ کسی دور دراز مقام پر جائے۔ اس وقت اس کے لیے بجز اس کے کوئی دوسری صورت نہیں ہوتی کہ وہ گلی گلی پتہ معلوم کرتا پھرے لیکن جب کوئی پڑھا لکھا شخص یہی راہ طے کرنا چاہے گا تو ہم کاغذ پر کھنچا ہوا ایک پورا نقشہ اس کے ہاتھ میں دیدیں گے اور وہ خود اس نقشے کے مطابق اپنا راستہ طے کرے گا۔یہی حال انسان کا ہے کہ جب اس نے ایک پیغمبر سے نظامِ زندگی کا مکمل نقشہ لے لیا تو اُسے دوسرے پیغمبروں کی ضرورت نہیں رہی۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ پچھلے پیغمبروں میں سے چند ایک کے علاوہ جو صاحبِ کتاب تھے اکثر انبیاءؑ،صرف تبلیغ کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے یہ نہیں تھا کہ وہ سب کے سب صاحبِ کتاب ہوں یا نئی شریعت لائے ہوں چنانچہ جب یہ بوجھ معصوم امام اور اسلام شناس اور متقی علماء اٹھا سکتے ہیں تو نبیوں کے آنے اور ان کی تبلیغ کی ضرورت نہیں ہے۔

بے شک خدا کے دین اور تعلیمات کی ہمیشہ ضرورت ہے لیکن دین کی تجدید ہمیشہ لازم نہیں

ہے۔ آخر میں اجتہاد کے مسئلے سے بھی ہم کو غافل نہیں رہنا چاہیے کیونکہ عادل فقیہوں کے پاس پورے قاعدے اور اصول موجود ہیں جن سے وہ خدا کا حکم معلوم کر سکتے ہیں۔

نبیوں کے دشمن

۱۔ طاغوت

قرآن مجید میں لفظِ طاغوت ۸ بار آیا ہے جس سے جھوٹے خدا، غاصب اور ظالم لوگ مراد ہوتے ہیں۔ یہ لفظ ایک فرد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور ایک گروہ کے لیے بھی۔ انبیاءؑ کا ایک بہت بڑا مقصد طاغوت کے خلاف لڑنا بھی ہے۔ خدا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہتا ہے:

تم فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ اس نے سرکشی کی ہے۔ (سورۂ طٰہٰ، آیت ۲۴)

''سامراج کے خلاف لڑائی'' کا نعرہ جو آج آزادی چاہنے والوں کا مشہور نعرہ ہے مندرجہ بالا آیت کا مختصر اور نامکمل سا ترجمہ ہے۔

اور موسیٰؑ جیسا پیغمبر جو اپنے سادہ سے لباس میں فرعون کے دربار کو لرزا دیتا ہے۔

۲۔ مترفان

یہ وہ دولتمند اور خوشحال لوگ ہیں جو انبیاءؑ کے طور طریقے اور تبلیغ کو اپنی مادر پدر آزادی کے خلاف پاتے ہیں تو مخالفت اور تخریب پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ (سورۂ ہود۔ آیت ۱۱۶ و سورۂ سبا۔ آیت ۳۴)

مثلاً وہ حضرت شعیب علیہ السلام سے کہتے ہیں: کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم انہیں چھوڑ دیں۔ جنہیں ہمارے بزرگ پوجتے تھے اور مال و دولت خرچ کرنے میں ہمیں جو آزادی حاصل ہے اس سے دستبردار ہو جائیں:

اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا

ہم سورۂ سبا میں یوں پڑھتے ہیں:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ

''ہم نے جس شہر میں بھی پیغمبر بھیجا وہاں کے عیاش، دولتمند اس کی مخالفت پر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ تمہیں جس کام کے لیے بھیجا گیا ہے ہم اس سے انکار کرتے ہیں۔(سورۂ سبا۔آیت ۳۴)

۳ علماء اور دانشور

یہودیوں اور عیسائیوں کے علماء اور دانشور پیغمبر اسلامؐ کو اتنی اچھی طرح جانتے تھے جس طرح وہ اپنی اولاد کو پہچانتے تھے(سورۂ بقرہ۔آیت ۱۴۶)

لیکن دل میں یہ سوچتے تھے کہ اگر ہم لوگوں کے سامنے حقیقت کھول دیں اور ان سے کہہ دیں کہ یہ محمدؐ وہی پیغمبرؐ ہیں جن کی بابت پیشین گوئی کی گئی ہے اور جن کی بشارت توریت میں موجود ہے تو ہم اجتماعی فائدے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اس لیے انہوں نے سچ کو چھپالیا جو سب سے بڑا اور نا قابل تلافی گناہ ہے۔

ہم حق کو چھپانے والوں کے بارے میں پڑھتے ہیں:

أُولَـٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ

''خدا، ملائکہ اور انسان ہمیشہ کے لیے ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔''(سورۂ بقرہ۔آیت ۱۵۹)

لوگ انبیاءؑ کی مخالفت کیوں کرتے تھے؟

۱۔ ہم عصری کی چشمک

بعض اوقات انسان کسی کی صحیح بات نہیں مانتا اور اس سے انکار کے لیے اس کے سوا اور کوئی دلیل نہیں رکھتا کہ بات کہنے والا بھی اسی زمانے کا ایک فرد ہے لیکن اس شخص نے یہ بات اگر دو ایک صدی پہلے کہی ہوتی اور مر چکا ہوتا تو لوگ اسے وحی آسمانی کی طرح قبول کر لیتے۔

اکثر عالموں کی قدر و قیمت ان کی زندگی میں چھپی رہتی ہے اور لوگ انہیں پہچانتے نہیں۔اگر کوئی پاکستانی باشندہ اصلاح احوال کے لیے بہترین نقشہ پیش کرے اور اس کی حیثیت معمولی ہو تو اس کے نقشے کو کوئی بھی قبول نہیں کرے گا اور اگر یہی نقشہ کوئی غیر ملکی پیش کرتا ہے تو ہم اسے بہت عظیم بتائیں گے۔

جب ہم تاریخ کی طرف آتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ ایک پیغمبر نے جس وقت طالوت کو ایک لشکر کا کماندار بنا دیا تو لوگوں نے نافرمانی کی اور کہا: اسے شخص کو کمانداری سے کیا واسطہ ہوسکتا ہے جس کی حیثیت ایک معمولی آدمی سے زیادہ نہیں ہے؟

تکبّر اور بہانہ

قرآن میں نبیوں کے مخالفوں کے پیش کیے ہوئے بہانوں سے متعلق کافی آیتیں موجود ہیں جن میں سے ہم چند ایک بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:

الف) اِئْتِ بِقُرْءَانٍ غَيْرِ هٰذَآ موجودہ قرآن کے علاوہ ایک اور قرآن لاؤ۔
(سورۂ یونس۔ آیت ۱۵)

ب) پورا قرآن ایک ہی بار نازل ہونے کے بجائے رفتہ رفتہ کیوں نازل ہوتا ہے؟
لَوْلا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً
وہ لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ صحیح تعلیم و تربیت کا بہترین طریقہ رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت دینا ہے کیونکہ کسی دوسری صورت میں باتیں دلنشین نہیں ہو پاتیں اور روح کی گہرائیوں میں نہیں اتر پاتیں۔

ج) اس پیغمبرؐ کے پاس باغ، خزانہ اور عمدہ سا گھر کیوں نہیں ہے؟
اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَه جَنَّةٌ
انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ مال و دولت رکھنے کا معاملہ خدا سے رابطہ رکھنے کے معاملے سے الگ ہوتا ہے۔ قرآن سورۂ طور کی بہت سی آیتوں میں ان تمام بہانوں کی راہیں بند کر کے نبیوںؑ کے مخالفوں سے ضمیر کی عدالت میں جرح کرتا ہے اور کہتا ہے:
کیا ان آسمانی پیغمبروں نے عقل کے خلاف کوئی بات کہی ہے جو تم عقل کی رو سے اعتراض اور نافرمانی کرتے ہو؟ (سورۂ طور۔ آیت ۳۱)

بے جا مطالبات کی وجہ سے انکار

قرآن کی بعض آیتوں میں ہم یہ پڑھتے ہیں کہ لوگ اپنے نبیوں سے بیجا امیدیں رکھتے تھے۔

مثلاً یہودیوں اور عیسائیوں کے مایک گروہ نے پیغمبر اسلامؐ سے یہ خواہش کی کہ خود ان پر آسمانی کتاب نازل ہو۔(سورۂ نساء۔آیت ۱۵۲) یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے بیمار کہے کہ میں خود طبیب بن جاؤں، میں دوسرے طبیب کے پاس جانے کو تیار نہیں ہوں چاہے مجھے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑیں۔وہ یہ نہیں سمجھتے کہ وحی کوئی ایسی چیز نہیں جو ہر قلب پر نازل ہو سکے۔سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ ہمیں خدا دکھادو۔(سورۂ نساء۔آیت ۱۵۲) قرآن بیجا مطالبات کے بارے میں یہ کہتا ہے:

اگر ہم وحی کو ایک کاغذ پر تحریر کی صورت میں نازل کریں اور یہ لوگ اس کاغذ کو اپنے ہاتھ میں لے لیں پھر بھی یہ ضدی کافر لوگ کہیں گے کہ یہ بھی جادو ہے۔(سورۂ انعام۔آیت ۷)

بیشک ایسے لوگ موجود ہیں کہ وہ ہر آیت، نشانی اور معجزہ دیکھ لیں پھر بھی ایمان لانے کو آمادہ نہیں ہیں۔(سورۂ انعام۔آیت ۲۵)

عیش پرستی کی وجہ سے انکار

کبھی کبھی مخالفوں کے پاس نہ کوئی بہانہ ہوتا ہے نہ کوئی غلط مطالبہ کرتے ہیں لیکن صرف اس وجہ سے کہ نبیوں کے کچھ احکام ان لوگوں کی خواہشات اور ذوق سے میل نہیں کھاتے۔وہ پیغمبروں کی دعوت قبول کرنے سے منہ موڑ لیتے ہیں۔اس سلسلے میں قرآن یوں کہتا ہے:

جب پیغمبر ایسے احکام لاتے تھے جو ان لوگوں کی ہوا و ہوس سے مطابق نہیں رکھتے تھے تو وہ یا ان مردانِ خدا کو جھٹلاتے تھے یا انہیں شہید کر دیتے تھے۔(سورۂ مائدہ۔آیت ۷۰)

یہ تھے تھوڑے سے اسباب انبیاءؑ کی مخالفت کے البتہ بزرگوں کی تقلید کا معاملہ بھی ان کفار کی ضد میں بڑی حد تک شامل تھا۔

❁❁❁❁

اِمامت

امامت اصولِ دین میں شامل ہے

۱۔ ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ خدا پیغمبرؐ کو تاکید کرتا ہے کہ اگر آپ نے اپنے صحیح جانشین کے تعارف اور تقرر میں کوتاہی کی اور معاشرے کی حفاظت کے خیال اور بعض منافقوں کی تخریب کاری کے خوف سے سستی برتی تو گویا آپ نے خدا کی پیغام رسانی ہی نہیں کی۔ ہم آیت کے زور دار لہجے اور پیغمبر خداؐ کی پوری تبلیغات کو جانشین کے تعارف اور تقرر سے وابستہ کر دینے سے یہ سمجھتے ہیں کہ امامت اصولِ دین میں شامل ہے۔

۲۔ کتاب وسائل الشیعہ کی پہلی جلد میں ۲۹ اور مستدرک الوسائل میں ۱۷ حدیثیں یہ بیان کرتی ہیں کہ اسلام کی بنیاد چند اصولوں پر ہے اور ان سب میں ولایت اور رہبر کا مسئلہ اس کی اہم ترین بنیاد سمجھی گئی ہے۔

الف: جیسا کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں، اسلام کی بنیاد نماز، زکات، حج، روزے اور ولایت پر قائم ہے۔ زرارہ جو امامؑ کے بڑے صحابیوں میں شمار ہوتا ہے، امامؑ سے دریافت کرتا ہے کہ ان بنیادوں میں سے کونسی سب سے زیادہ اہم ہے؟ امامؑ فرماتے ہیں: ولایت سب سے زیادہ اہم اور پھر اس کی وضاحت یوں فرماتے ہیں: **لانها مفتاحهن والوالی هو الدلیل علیهن**۔ کیونکہ ولایت نماز، روزے اور حج کی کنجی ہے اور والی تمام معاملات میں

رہبر اور ہادی ہوتا ہے البتہ ولایت سے امام معصومؑ کی اطاعت مراد ہے کیونکہ بعض روایت میں ولایت کے لفظ کی جگہ اطاعت امام کا لفظ آیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نماز، روزے، حج اور زکات میں سے ہر ایک بنیاد مالی اور جسمانی قوت نہ ہونے کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے لیکن امام حق کو تسلیم کرنے کا مسئلہ ہر حال میں یکساں طور پر قائم رہتا ہے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ پیغمبر اکرمؐ نے نماز، روزے اور حج کے احکامات بیان کرنے کے لیے نہ تو لوگوں کو جمع کیا اور نہ سب کے سامنے بہ آواز بلند اعلان کیا لیکن امام کے تعارف اور تقرر کی خاطر غدیر خم کے بیابان میں بڑی دیر تک لوگوں کے جمع ہونے کا انتظار کیا اور جیسے ہی سب لوگ ایک جگہ اکٹھے ہو گئے معصوم رہبر یعنی امام کے تقرر کا علی الظاہر اعلان فرمایا۔

اس سے قطع نظر کہ لوگ اصل مسئلے ہی کو چھوڑ بیٹھے مجھے خوب یاد ہے کہ خانۂ خدا کا طواف کرتے وقت جب میں نے کعبے کو دیکھا تو اس خیال میں ڈوب گیا کہ یہ کعبہ امام علی علیہ السلام کی والدہ گرامی کے لیے زچہ خانہ اور خود امام علی علیہ السلام کا گہوارہ ہے کہ جنہوں نے اسی کعبے کی چھت پر سے بتوں کو توڑ پھوڑ پھینکا تھا۔ پھر میں ان طواف کرنے والوں کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ یہ لوگ بچے کو گہوارے سے باہر گرا کر کس طرح اس گہوارے کے گرد گھوم رہے ہیں۔

۳۔ تیسری دلیل جو امامت کی اہمیت کے لیے دی جا سکتی ہے وہ یہ مشہور حدیث ہے:

مَنْ ماتَ وَلَمْ یَعْرِفْ إمامَ زَمانِهِ مَاتَ مِیتَةً جَاهِلِیَّة

(اگر کوئی اس حال میں مر جائے کہ وہ اپنے زمانے کے امام کہ نہ جانتا ہو تو گویا وہ ظہورِ اسلام سے پہلے کے زمانہ جاہلیت کی موت مرا)

۴۔ اصولِ کافی کی تیسری جلد میں لکھا ہے کہ وہ لوگ جو امام حق سے تعلق کے بغیر خود سے اعمال بجالانے کی زحمت اٹھاتے ہیں خدا ان اعمال کو قبول نہیں کرے گا۔

مختصر یہ کہ توحید اس وقت تک توحید ہے جب تک معاشرے کا حاکم معصوم رہبر ہو ورنہ توحید کی جگہ طاغوت پھلیں پھولیں گے۔ نبوت اور نبیوں کا قانون اس وقت تک قائم ہے جب تک کہ

معصوم رہبر اس کی حفاظت کرتا ہے ورنہ آسمانی قوانین بے کار باتوں، تبدیلیوں، بدعتوں اور شخصی طریقوں میں گھل مل جائیں گے اور روحِ آسمانی جدا ہو کر رہ جائے گی۔

قیامت اور اس کے روحانی مسائل سے واقفیت بھی امام کے طریقے کے علاوہ کسی اور طریقے سے ممکن نہیں ہے۔ اگر ہم عقل سے کام لیں تو یہ سمجھ میں آجائے گا کہ معاشرہ قانون اور رہبر کے بغیر ایک جنگل کی طرح ہے اور قانون اور رہبر دونوں میں سے کوئی ایک بھی دوسرے سے الگ نہیں ہوسکتا۔ اس طرح رہبری اور امامت کے مسئلے اور معاشرے کے نظام اور قانون کی حفاظت اور بقا میں اس کے کردار سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

توحید سے امامت کا تعلق

جس وقت امام علی رضا علیہ السلام شہر نیشاپور سے گزر رہے تھے تو ان کے عقیدتمندوں نے انہیں گھیر لیا اور ان سے ایک حدیث بیان کرنے کی التجا کی۔ امام علیہ السلام نے ایک حدیث جو انہوں نے اپنے والد سے اور ان کے والد نے اپنے والد سے یہاں تک کہ پیغمبر اکرمؐ سے اور انہوں نے جبرائیلؑ امین اور انہوں نے خداوند عالم سے سنی تھی، اس طرح بیان فرمائی کہ خدا فرماتا ہے: كَلِمَةُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ حِصْنِي فَمَنْ دَخَلَ حِصْنِي... عَذَابِي، یعنی توحید میرا قلعہ ہے۔ جو شخص اس میں داخل ہو جائے گا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہو جائے گا۔ امام رضا علیہ السلام یہ حدیث فرما کر آگے بڑھے۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ لوگوں نے دیکھا امام علیہ السلام رُک گئے اور فرمانے لگے بِشُرُوطِهَا وَأَنَا مِنْ شُرُوطِهَا، یعنی توحید[1] اپنی شرائط کے ساتھ خدائی قلعہ ہے اور میں خود ان شرائط میں سے ایک شرط ہوں۔ اس مقام پر امامؑ نے توحید اور امامت میں شرط اور مشروط کا رشتہ قرار دیا وہی رشتہ جو مشین (گاڑی) اور اس کے پہلے میں ہے یا نماز اور وضو میں ہے یعنی امامت کے پائے کے بغیر توحید پر لوگوں کا ایمان ڈگمگانے لگتا ہے۔

---

(۱) بحار الانوار۔ جلد ۳۔ طبع جدید

امام کی ضرورت

جس دلیل کی رو سے ہمیں ایک پیغمبر کی ضرورت ہے اسی دلیل کے تحت ہم وجودِ امام کے بھی حاجتمند ہیں اور اگر انسان زندگی کی راہ تلاش کرنے میں خود کفیل ہوتا تو اسے انبیاءؑ کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ ہم نے اس سے پہلے نبوت کے متعلق جو بحث کی ہے اس میں پیغمبر کی ضرورت کی دلیلیں پیش کر چکے ہیں۔

کیا قرآن کافی نہیں ہے؟

قرآن ایک ایسی کتاب ہے کہ تمام اسلامی جماعتیں اور فرقے اس کی آیات کو سند مانتے ہیں اور ہر شخص ان میں سے کچھ آیتیں منتخب کر کے ان سے اپنے فائدے کے لیے استدلال کرتا ہے۔ پھر یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ قرآن امام کے بغیر صحیح راستہ پا لینے میں معاشرے کے لیے کافی ہے؟

کیا طب کا قانون اور کتاب طبیب کے بغیر بیماروں کو شفایاب کر سکتے ہیں؟

کیا قانون کسی حاکم، تشریح کرنے والے، جاری کرنے والے اور سمجھنے والے کے بغیر تنہا کافی ہے؟

کیا ہر نظریہ ایک صاحبِ نظریہ نہیں رکھتا؟

کیا یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد تو عبادت کرنا اور خدا کی راہ اختیار کرنا ہو لیکن اس سلسلے میں اسے راہ دکھانے والے کی ضرورت نہ ہو؟

کیا یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ انسان، انسانیت کے بلند مقام تک پہنچنے کا عاشق تو ہو لیکن دنیا میں اس کے سامنے کسی ایسے معشوق کا وجود ہی نہ ہو؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ ہر داخلی و باطنی احساس کے لیے ایک خارجی و ظاہری حقیقت بھی موجود ہو جو اس کی تسکین کرتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام کی ضرورت پر بحث کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ امام اور رہبر کے بغیر اجتماعی زندگی قائم نہیں رہ سکتی اور امام کی ضرورت ناقابل تردید ہے

چنانچہ سب جانتے ہیں کہ خدائی قوانین کے نفاذ اور احکامِ الٰہی کی حفاظت کی خاطر طاقت اور حکومت ضروری ہے اور طاقت اور حکومت کو صحیح راستے پر لے جانے کے لیے ایک لائق امام کی ضرورت ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ انسان کی رسائی پیغمبر تک نہیں ہوسکتی اور اس نے ختم نبوت کو دل سے مان لیا ہے، امام کی ضرورت نا قابل تردید ہے۔

کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ خدا انسان کے لیے ایک پیغمبر بھیجے اور وہ سخت جانفشانی سے خدا کے احکام اور قوانین کو معاشرے میں جاری کرے اور پھر وہ سب کچھ چھوڑ چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو جائے؟ کیا یہ کام دانائی کا ہے؟ کیا اُمت کو بغیر ہادی کے چھوڑ کر چلا جانا پیغمبر کی اس محبت اور ہمدردی سے جس کا ہمیں علم ہے، میل کھاتا ہے؟

امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں:

إِنَّ الْإِمَامَةَ زِمَامُ الدِّينِ وَنِظَامُ الْمُسْلِمِينَ أُسُّ الْإِسْلَامِ النَّامِي (۱)

سچی رہبری سے مکتب اور دین مستحکم ہوتا ہے اور امامت کے ہاتھوں قائم شدہ اسلامی معاشرے کا نظام اسلام کو وسعت اور ترقی دیتا ہے حتیٰ کہ وہ انسانی قافلے کی تمام انفرادی اور اجتماعی، مادی اور معنوی ضروریات کی کفالت کرسکتا ہے۔ امام علی رضا علیہ السلام ترقی پذیر اسلام کی اس تشریح سے ہمیں یہ سمجھاتے ہیں کہ امام کے بغیر اسلام نشوونما اور ترقی نہیں پاسکتا بلکہ زوال پذیر ہوجاتا ہے اور سچی بات بھی یہی ہے کہ کیونکہ روز، ہر مہینے اور ہر سال انسانی معاشرہ ایسے حوادث سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ کہ اگر خدا کا حکم اور اس کی سنت وحی اور سچے رہبر سے مدد نہ کرے تو لوگوں کا چین جاتا رہے اور ہر ایک اپنی اپنی راہ پر چلنے لگے اور پھر اسلامی معاشرہ انتشار میں مبتلا ہوجائے اس لیے مکتب کے ساتھ ساتھ رہبر بھی ہونا چاہیے۔

سچ مچ کیا جھیل پر کسی تیراکی سکھانے والے یا پار لگانے والے کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا دریا

---

(۱) سفینۃ البحار (امام)

کو عبور کرنے کے لیے کشتی کی ضرورت نہیں ہے؟ کیا ایک قول کے مطابق دنیا ایک گہرا سمندر اور طوفانی دریا نہیں ہے؟ کیا اہل بیتؑ اور معصوم امامؑ نجات کی کشتی نہیں ہیں؟ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ خدا اس دنیا کو دریا کی طرح پیدا کرے اور لوگوں کو اس دریا میں تیرتے ہوئے دیکھے اور رات دن اس میں ہزاروں ڈوبنے والوں کی خبر نہ لے جبکہ دریا بھی ایسا ہے کہ اس میں بھنور پڑتے ہیں، خونخوار جانور رہتے ہیں، یہ خوف دلاتا ہے اور حواس باختہ کر دیتا ہے اور اس میں تیرے والے ایسے ہیں کہ اس کی گہرائی اس کے موذی جانوروں اور اس کے خطروں سے واقف نہیں ہیں پھر کس طرح خدائے دانا ان تیرنے والوں کو اس خطرناک دریا میں ان کے حال پر چھوڑ سکتا ہے؟ یہ بات خدا کی کس حکمت سے میل کھاتی ہے؟ بے شک اگر ہم ذرا اسی دیر کے لیے غور کریں تو یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ ہمارے لیے معصوم رہبروں کی موجودگی ضروری ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا نے جسم کے ملک کی حکومت تو عقل کو سونپ دی ہوتا کہ اس کے ذریعے سے آنکھ اور کان گمراہی اور غلطی سے محفوظ رہیں لیکن دنیا کے عظیم انسانی معاشرے کے لیے خدا کی طرف سے کوئی امام پریشانی دور کرنے، راستہ دکھانے اور اختلافات مٹانے کے لیے مقرر نہ کیا ہو؟

امامت اور رہبری کا مقصد

اسلام کی نظر میں دنیا، مال، عہدہ، اختیار اور حکومت ذریعہ ہے، مقصد نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اولیاء اللہ کے ہاتھ میں اختیار بھی آ جائے تو وہ اپنی سادہ زندگی کو ترک نہیں کرتے اور اتراہٹ، شیخی، غرور اور بداخلاقی کی طرف نہیں جاتے۔ ہم اس سرائے آخرت کو اس کی تمام بے شمار نعمتوں کے ساتھ صرف ان لوگوں کے لیے مخصوص کرتے ہیں جو زمین پر سرکشی اور فساد کا ارادہ نہیں کریں گے۔ (سورہ قصص۔آیت ۸۳)

ابن عباس کہتے ہیں کہ میں امام علی علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا تو دیکھا کہ امام اپنا جوتا گانٹھ رہے تھے۔ امامؑ نے پوچھا اس پھٹے جوتے کی کیا قیمت ہوگی؟

میں نے کہا اس کی کچھ بھی قیمت نہیں ہے۔

امامؑ نے فرمایا:

وَاللّٰهِ لَهِيَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ إِمْرَتِكُمْ إِلَّا أَنْ أُقِيمَ حَقّاً أَوْ أَدْفَعَ بَاطِلًا

خدا کی قسم! میرے نزدیک یہ پھٹا جوتا تم پر حکومت کرنے سے زیادہ قیمتی ہے بجز اس صورت کے کہ میں حق کو قائم کروں اور باطل کو دفع کروں۔ (۱)

بے شک امامت اور رہبری عیش و آرام کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کو شرک، ظلم، جہالت اور تفرقے سے نجات دلانے کے لیے ہوتی ہے نہ کہ رہنماؤں کی عیش پرستی اور مفاد پرستی کے لیے۔ اختیار حاصل کرنے کے لیے معصوم اماموں کی کوشش خدائی احکام کو نافذ کرنے کی خاطر تھی اس لیے اسلام میں امامت فرد مایہ نہیں ہے بلکہ ذمہ داری ہے۔ آرام نہیں ہے بلکہ بوجھ ہے اس لیے امام اپنی زندگی میں بالکل معمولی طور سے رہتے تھے، عام اور سادہ لباس اور غذا کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ ضرورت کے وقت دوسروں کی طرح کچہری میں حاضری دیتے تھے۔ کام کرتے تھے اور کسی قسم کی غیر معمولی مراعات نہیں رکھتے تھے۔

امام علی علیہ السلام نے ایک خط میں ابن عباس کو یوں لکھا تھا:

أَمَّا بَعْدُ، فَلَا يَكُنْ حَظُّكَ فِي وِلَايَتِكَ مَالاً تَسْتَفِيدُهُ، وَلَا غَيْظاً تَشْتَفِيهِ، وَلَكِنْ إِمَاتَةُ بَاطِلٍ وَإِحْيَاءُ حَقٍّ

"تمہیں جو حکومت حاصل ہے اس میں دولت جمع نہ کرو۔ تمہیں یہ مناسب نہیں ہے کہ اپنے اختیار سے ناجائز فائدہ اٹھاؤ اور اپنے دشمنوں اور مخالفوں پر غصہ کرو بلکہ تمہارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ باطل کو مٹاؤ اور حق کو زندہ کرو۔ (۲)

امام کی علامات اور صفات

چونکہ امت کی امامت، رہبری اور ہدایت کا معاملہ زندگی کے اہم ترین معاملوں میں سے

(۱) نہج البلاغہ۔ خطبہ ۳۳ (۲) بحار الانوار، جلد ۴۰، صفحہ ۳۲۸

ہے اور یہ بات ہر وقت ممکن ہے کہ امت جھوٹے پرچاوں کی وجہ سے کسی نہ کسی کے دھوکے میں آجائے، اس لیے قرآن نے اور رسول اکرمؐ نے بھی ایسی علامات اور شناختیں بتائی ہیں جو انسان کے سامنے راستے اور گڑھے کو واضح کرسکتی ہیں۔ ہم یہاں ان علامتوں اور شناختوں کا خلاصہ سیدھے سادھے طریقے سے پیش کیے دیتے ہیں۔

۱۔ ایک فقیر مسجد نبویؐ میں داخل ہوا اور اس نے لوگوں سے سوال کیا لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ فقیر نے کہا: اے خدا! تو گواہ رہنا ان لوگوں نے مجھے محروم رکھا (مایوس کیا)۔ امام علی علیہ السلام اس وقت رکوع کی حالت میں تھے، آپ نے فقیر کو اشارہ کیا۔ جیسے ہی وہ سامنے آیا آپ نے اسے اپنی انگوٹھی بخش دی۔ اسی موقع پر سورۂ مائدہ کی آیت ۵۵ نازل ہوئی کہ تمہارا ولی صرف خدا، اس کا رسولؐ اور وہ شخص ہے جس نے رکوع کی حالت میں زکات دی۔ یہ ایک ایسی علامت ہے کہ جس سے لوگوں نے یقینی طور پر سمجھ لیا کہ وہ امام علیؑ ہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے پہلے بھی امام علی علیہ السلام کا مرتبہ سب پر واضح تھا لیکن انگوٹھی کا عطا کرنا صرف ولایت و امامت کے اس مرتبے کی نشانی، علامت اور شناخت کے لیے تھا کہ آپ خدا اور رسولؐ کے برابر امت کی سرپرستی اور امامت کا حق رکھتے ہیں ورنہ محض رکوع میں انگوٹھی دے دینا اپنی جگہ امامت کے مرتبے کو ثابت نہیں کرسکتا البتہ لوگوں کے سامنے فضیلت کی علامت اور شناخت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

۲۔ پیغمبر تئیس ۲۳ سال تک کارِ رسالت میں مشغول رہے۔ ہر سال کے ۳۶۵ دن کے حساب سے آپ کی تبلیغ کے دنوں کی مجموعی تعداد ۸۳۹۵ دن ہوتی ہے۔

ایک آیت میں یہ بات نازل ہوئی کہ:

۱۔ آج تم مسلمانوں کے دین سے تمام کافر مایوس ہوگئے۔

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ

۲۔ آج تمہارا دین کامل ہوگیا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ

۳۔ آج میں نے اپنی تمام نعمتیں تم پر پوری کر دیں۔

وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ

۴۔ آج کے دن میں نے تمہارے لیے مکتب اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے قبول کیا۔

وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۱)

آپ ان کئی ہزاروں پر نظر ڈالیں جن میں آنحضرتؐ پیغمبر کا فریضہ ادا کرتے رہے اور ان میں ایسا ایک دن ڈھونڈ نکالیں جس پر مندرجہ بالا خصوصیات کا اطلاق ہوتا ہو۔

یہ بات مانی ہوئی ہے کہ وہ تمام دن ایک جیسے نہیں ہیں بلکہ ان میں سے ایک دن خاص اور اہم ہوگا چنانچہ ہم دورِ رسالت کے اہم دنوں کا ذکر کرتے ہیں تا کہ یہ دیکھیں کہ مندرجہ بالا آیت کس دن پر منطبق ہوتی ہے۔

۱۔ کیا یہ بعثت کا پہلا دن ہے؟ نہیں اس لیے کہ پہلے دن نہ دین کامل ہوا تھا نہ کافر مایوس ہوئے تھے۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔

۲۔ کیا یہ اسلام کی اعلانیہ دعوت کا دن ہے جب پیغمبر کو تین سال کی خفیہ تبلیغ کے بعد خدا کا یہ حکم آیا کہ اپنی دعوت کو ظاہر کر دو؟ نہیں۔ یہ وہ دن نہیں ہے اس لیے کہ وہ دن بھی کام کے آغاز کا دن تھا اور ابھی کام کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔

۳۔ کیا یہ ہجرت کا دن تھا یا حضرت فاطمہ زہراؑ کی ولادت کا دن تھا یا بدر کی لڑائی میں کامیابی کا دن تھا؟ نہیں کیونکہ ہجرت بدر کی فتح اور فاطمہ زہراؑ کی ولادت کے بعد پیغمبر کی زندگی میں برسوں تک آیتیں نازل ہوتی رہیں اس لیے ان دنوں کو دین کی تکمیل کا دن نہیں سمجھا جا سکتا۔

۴۔ کیا وہ دن جس کی خدا نے چار خصوصیات بیان فرمائی ہیں ۸ھ میں فتح مکہ کا دن سمجھا جائے یا ۹ھ میں مکے کے مشرک زائروں کے متعلق فیصلے کا دن مانا جائے۔ نہیں کیونکہ فتح مکہ میں صرف مکے کے کفار مایوس ہوئے تھے۔ تمام کافر مایوس نہیں ہوئے تھے اور پھر یہ کہ ۸ھ میں

(۱) سورۂ مائدہ۔ آیت ۳

سے ۱۰ھ میں پیغمبرؐ کی رحلت تک اس دوسال میں دسیوں آیتیں اور احکامات نازل ہوئے اس لیے ۸ھ کے کسی دن کو دین کی تکمیل اور نعمتوں کے پورا ہونے کا دن نہیں سمجھا جا سکتا۔

۵۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ دن روزِ عرفہ ہو جبکہ پیغمبرؐ لوگوں کے ساتھ حج کے مناسک انجام دینے میں مشغول تھے؟ نہیں اس لیے کہ آنحضرتؐ کا مراسم حج بجالانا دین کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے، پورا دین نہیں ہے اور قرآن فرماتا ہے کہ آج تمہارا دین مکمل ہو گیا۔

مختصر یہ کہ اگر ہم تلاش کریں اور یہ دیکھیں کہ وہ کون سا دن ہے تو تمام دن کی پڑتال کے بعد غدیر خم کے دن تک پہنچیں گے جو بقرعید کے آٹھ دن بعد پڑتا ہے۔ وہ پیغمبرؐ کی عمر کا آخری سال تھا جب آپ نے لوگوں کے ساتھ حج کے مراسم ادا کیے اور واپس مدینے آ رہے تھے کہ ایسے مقام پر پہنچے جہاں لوگ ایک دوسرے سے الگ ہوتے تھے اور ہر علاقے کے لوگ اپنے اپنے وطن (یمن، مدینہ، عراق اور حبش) کی طرف چلے جاتے تھے۔ اس مقام پر امام علی علیہ السلام کے بطور امام اور جانشین پیغمبرؐ تقرر کا حکم آیا۔ جب آنحضرتؐ نے خصوصی اہتمام کے ساتھ امام علیؑ کو خدا کی طرف سے امت کی رہبری کے لیے امام مقرر فرمادیا تو مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

۱۔ آج کفار مایوس ہو گئے کیونکہ آپ پر لگائے گئے ان کے الزامات (شاعر، جادوگر، دیوانہ) باطل ہو کر رہ گئے، بدر، خیبر اور خندق وغیرہ کی لڑائیاں اسلام کے حق میں ختم ہو گئیں اور تمام سازشیں بھی بے اثر ہو گئیں۔ کفار کی واحد امید پیغمبرؐ خدا کی موت سے وابستہ تھی کیونکہ انہوں نے اپنی جگہ پر یہ حساب لگا لیا تھا کہ اب پیغمبرؐ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ان کے کوئی بیٹا بھی نہیں ہے اور انہوں نے اپنا کوئی جانشین بھی مقرر نہیں کیا ہے۔ ان کی موت کے ساتھ ہی اسلام کا زور ختم ہو جائے گا لیکن جب انہوں نے غدیر کے دن یہ دیکھا کہ علیؑ نامی ایک شخص جو ہر بیٹے سے زیادہ لائق ہے پیغمبرؐ کا جانشین متعین ہو گیا ہے تو کفار کی رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی۔(۱) بیشک کفار اس دن مایوس ہو گئے۔

۲۔ اسی دن دین بھی کامل ہو گیا جب قانون کے ساتھ حاکم کا تعین ہو گیا۔ قانون کے ساتھ اس کا جاری رکھنے والا آ گیا۔ نقشے کے ساتھ نمونے کا تعارف بھی کرا دیا گیا اور اسلام کی اس

تحریک کو آگے بڑھانے والا مقرر ہو گیا۔ (اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ) رہبر کے بغیر دین بے طبیب کی دوا کی طرح کامل نہیں ہوسکتا۔

۳۔ آج کے دن تم مسلمانوں پر اللہ کی نعمتیں پوری ہوگئیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ چاہے تمام نعمتیں موجود ہوں لیکن اگر رہبری کی ایک نعمت نہ ہو تو وہ سب ادھوری ہیں کیونکہ وہ رہبر ہی ہوتا ہے جو اپنی ہدایت سے لوگوں کو ترغیب دیتا ہے تا کہ خدا کی نعمتیں اپنی اصلی راہ پر باقی رہیں۔

آج جب تمہیں ایک قانون نافذ کرنے والا ایک لائق حاکم بھی مل گیا ہے اور اسلام ہر پہلو سے کامل ہو گیا ہے اور میں نے اس مکتب اسلام کو تمہارے لیے چن لیا ہے اور میں تمہارے لیے اس آئین حیات پر راضی ہوں۔

کبھی پیغمبرؐ دلچسپ تشبیہوں سے لوگوں کو معصوم کی رہبری کی طرف متوجہ فرماتے تھے جیسے اہل بیتؑ کی کشتیٔ نوحؑ سے تشبیہ۔ آپ نے فرمایا (مَثَلُ اَھْلِ بَیْتِیْ کَمَثَلِ سَفِیْنَۃِ نُوْحٍ مَنْ رَکِبَھَا نَجٰی) (۲) میرے اہل بیت حضرت نوحؑ کی کشتی کے مانند ہیں کہ جو مومن اس پر سوار ہوئے انہوں نے نجات پائی اور جو کفار ایمان نہیں لائے اور سوار نہیں ہوئے وہ ڈوب گئے۔ کبھی آپ فضیلتیں بیان کر کے امام معصوم کی علمی شخصیت اور مرجعیت کی طرف لوگوں کی توجہ دلاتے تھے جیسے (اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُھَا) (۳) میں علم کا شہر ہوں اور علی ابن ابی طالبؑ اس شہر کا دروازہ ہیں۔

یہاں تک کہ وقت آخر بھی اپنی کوشش میں آپ نے کوئی کمی نہیں کی اور فرمایا کہ قلم اور کاغذ لے آؤ تا کہ میں تمہارے لئے کچھ لکھ دوں لیکن افسوس کہ آپ کو ایسا جواب دیا گیا جو نہ ادب کے تقاضے پورے کرتا ہے نہ شیریعت کے اور نہ قرآن کے۔

سوال: اس تمام سفارش، تعین، حمایت، لیاقتوں اور فضیلتوں کے باوجود جو امام علیؑ میں

---

(۱) اب ایک ہی صورت تھی جو اُن کی اُمید بندھ جائے اور وہ یہ کہ مسلمان پیروئ رسولؐ میں کوتاہی کر جائیں۔

(۲) الغدیر جلد ۲، صفحہ ۳۰۱ (۳) تفسیر برہان جلد ۱۔ صفحہ ۱۹۱

تھیں کیونکر لوگ انہیں مدتوں تک چھوڑے رہے؟

جواب: خدا کے حکم کو ٹھکرانے کی بات کوئی نئی نہیں ہے۔قرآن کی اتنی آیتوں نے ہمیں پرہیزگاری اور امانت کی دعوت دی ہے پھر پرہیزگاری کم کیوں ہے اور کیوں نہیں شیطان نے آدم کو سجدہ کرلیا؟ کیا حضرت موسیٰؑ کی اُمت ان کے ہی زمانے میں جب اس نے حضرت موسیٰؑ کو کچھ دنوں کے لیے نہیں دیکھا منحرف نہیں ہوگئی ؟ پس بھول سہو اور بے توجہی انسان کا خاصہ ہے ۔ہاں صرف وہ لوگ جو اپنی تنظیم وتعمیر کر کے خود کو خدا کی خاص مہربانی کا مستحق قرار دیتے ہیں اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں۔دوسری جانب وہ پرانی دشمنیاں جو بعض لوگ امام علی علیہ السلام کے ساتھ رکھتے تھے اس بات کا سبب بنیں کہ وہ آپ کو اپنا امام نہ مانیں۔وہ لوگ جو بدر، احد، خیبر اور حنین کی لڑائیوں میں قتل ہوئے کسی نہ کسی خاندان اور قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے اعزا اپنے باپ بیٹے اور چچا کے قاتل کو امام ماننے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔لوگوں کو ان کی امامت قبول نہ کرنے کا یا ایک بار قبول کر کے برگشتہ ہوجانے کا دوسرا سبب امام کے انصاف اور صحت عمل کا مسئلہ تھا۔یہ مسئلہ بیعت توڑنے والوں اور ان لوگوں کے بارے میں واضح طور پر نظر آتا ہے جو قتل عثمان کے بعد امامؑ کے گرد اکٹھے ہوگئے تھے لیکن جنہوں نے بعد میں بیعت توڑ کر جنگ جمل کھڑی کردی۔یہ لوگ امام سے غیر معمولی مالی اور معاشرتی حقوق اور اضافی فوائد کی اُمید رکھتے تھے لیکن انہوں نے یہ دیکھا کہ امام کسی سے کوئی رعایت نہیں برتتے اس کے علاوہ کچھ مشہور اور خودغرض لوگ امام کے سامنے یہ پیشکش رکھتے تھے کہ ملکی کاموں میں ہم سے صلاح مشورہ کیا جائے۔ان کے جواب میں حضرت فرمادیتے تھے کہ جس کام کے بارے میں مجھے خدا اور رسولؐ کے حکم اور ان کی رضامندی کا علم نہیں ہوگا اس کے بارے میں سب سے مشورہ کرلیا کروں گا اور تم بھی لازماً ان سب لوگوں میں شامل ہوگے۔وہ لوگ غیر معمولی فائدے کی اُمید رکھتے تھے لیکن امام جو غریبوں کے مال کی حفاظت میں بہت سخت تھے اور محاورے کے مطابق دودھ میں سے مکھی نکال لیتے تھے اس کے لئے آمادہ نہیں تھے کہ ان کے غیر منصفانہ مطالبے پر کان دھرا جائے۔

ہاں لوگوں کے امام علیؑ کو چھوڑنے کی ایک وجہ آپ کا انصاف اور باریک بینی تھی۔

اظہارِ حق اور اس کی کوشش

قرآن اور رسول اکرمؐ کے تعارف کے علاوہ خود امام علیؑ نے بھی کتنے ہی موقعوں پر اپنی سچائی ،لیاقت اور فضائل کا اعلان فرمایا ہے مثلاً نہج البلاغہ میں امام علیؑ اس شخص کے جواب میں جو آپ سے پوچھتا ہے کہ آپ حکومت پر کتنے حریص ہیں،آپ فرماتے ہیں (اِنَّمَا طَلَبْتُ حَقًّا لِیْ) میں صرف اس حق کا مطالبہ کرتا ہوں جو میرے لیے ثابت ہے۔

دوسرے مقام پر امام ع فرماتے ہیں(اَرٰی تُرَاثِیْ نَہْباً) میں اپنے حق وراثت کو لٹتا ہوا دیکھتا ہوں۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں (لَقَدْ عَلِمْتُمْ أَنِّی أَحَقُّ النَّاسِ بِہَا مِنْ غَیْرِی) تم لوگ جانتے ہو کہ میں خلافت میں دوسروں سے زیادہ لائق انسان ہوں۔

ایک اور جگہ امامؑ فرماتے ہیں (اِنَّ مَحَلِّیْ مِنْہَا مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحَا) حکومت اور خلافت میں میری جگہ وہی ہے جو چکی کے پاٹ میں کیلی کی ہوتی ہے اور یوں امیر المومنین علی علیہ السلام خدائی رہبر اور امام کے مسئلے کا لوگوں میں اعلان فرماتے تھے۔

امام کو معصوم ہونا چاہیے

عصمت کے صرف یہی معنی نہیں ہیں کہ گناہ نہ کرے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ گناہ کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔

امام بھی اپنے بے انتہا علم اور یقین کے باعث جو وہ رکھتے ہیں۔تمام گناہوں سے واقف ہیں لیکن وہ ان میں سے کسی کے قریب تک نہیں جاتے۔

عدل وانصاف

جہاں سب لوگ انصاف کے طالب ہوں وہاں امام کو انصاف کا کھلا ہوا نمونہ ہونا چاہیے۔

۱۔ امام علیؑ نے اپنے ایک عامل کے نام خط میں اسے خبردار کیا: اگر میں نے سنا کہ تم نے بیت المال میں بے ایمانی کی ہے تو خدا کی قسم میں تمہارے ساتھ سختی سے پیش آؤں گا (نہج البلاغہ ۔مکتوب ۲۰)

۲۔ تدبیر مملکت کے متعلق اپنے مشہور عہد نامے میں مالک اشتر کو یوں لکھا: ملک کے دور دراز مقامات کے لیے بھی اتنا ہی حصہ ہونا چاہیے جتنا قریب ترین مقامات کے لیے ہو۔

۳۔ اپنے قاتل ابن ملجم کے بارے میں فرمایا: میرے قاتل کے سوا اور کسی کو قتل نہ کرنا بلکہ یہاں تک فرمایا کہ جس طرح اس نے مجھ پر ایک وار کیا ہے تم بھی اس پر ایک ہی وار کرنا اور دھیان رہے کہ تمہارا اقدام انصاف سے باہر نہ نکلے۔ (نہج البلاغہ۔مکتوب ۴۷)

امام علیؑ نے فرمایا: خدا کی قسم! اگر ہفت اقلیم مجھے اس لیے دے دی جائیں کہ میں چیونٹی پر ظلم کر کے اس کے منہ سے جو کا چھلکا نکال لوں تو میں یہ گناہ ہرگز نہیں کروں گا۔

ایک اور واقعہ کے مطابق امامؑ نے جب سنا کہ ایک غیر مسلم عورت کا زیور چھین لیا گیا اور اس طرح اس پر ظلم کیا گیا ہے اور اسے عام تحفظ بھی نہیں دیا گیا تو آپ اس قدر ناخوش ہوئے کہ فرمانے لگے کہ اگر اس افسوس ناک واقعے سے مسلمان کی جان بھی نکل جائے تو بجا ہے (نہج البلاغہ فیض الاسلام۔صفحہ ۹۵)

امام کو اپنی خواہشات قابو میں رکھنا چاہیں

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: هَيْهَاتَ اَنْ يَّغْلِبَنِيْ هَوٰی کتنے افسوس کی بات ہوگی جو میری خواہشات مجھ پر غالب آجائیں اور مجھے سچائی اور انصاف کے راستے سے دور کر دیں ۔امام صادقؑ، امام علیؑ سے نقل کرتے ہیں کہ امامت کی بہت سی شرائط ہیں۔ان میں سے ایک یہ

ہے کہ لَا یَلْهُوْهُ شَیْءٌ مِّنْ اَمْرِ الدُّنْیَا[۱] مادی اور دنیاوی معاملے اس کو مشغول اور منہمک نہیں کرتے۔

امام کو بہادر ہونا چاہیے

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: وَمَا اُهَدَّدُ بِالْحَرْبِ

''اب تک کسی لڑائی نے مجھے خوفزدہ نہیں کیا اور نہ میری روح پر کوئی اثر چھوڑا ہے۔''[۲]

امام صادق علیہ السلام، امام علی علیہ السلام سے نقل فرماتے ہیں کہ امام کو سب سے زیادہ بہادر ہونا چاہیے۔[۳]

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ امام کو ڈرپوک نہیں ہونا چاہیے۔[۴]

موت اور شہادت کی بات امام کے سامنے بالکل واضح ہونا چاہیے۔

امام علیؑ فرماتے ہیں: ''خدا کی قسم! موت سے مجھے اتنی رغبت ہے۔ جتنی بچے کو اپنی ماں کی چھاتی سے بھی نہ ہوگی۔[۵]

امام کو برتر اور صاحبِ کمال ہونا چاہیے

امام علی علیہ السلام اپنے دسویں خط میں جو نہج البلاغہ میں درج ہے معاویہ کو یوں لکھتے ہیں:

اے معاویہ! تجھے سیاست اور خلائق کی حاکمیت سے کیا تعلق ہے؟ نہ تیرا پچھلا کردار اچھا ہے اور نہ تو کوئی بزرگی، بڑائی اور کمال رکھتا ہے۔ ہاں! امام کے سابقہ کردار میں بھی کوئی نقص نہیں ہونا چاہیے۔

امام کو خدا کی کتاب کے مطابق حکم دینا چاہیے:

فَلَعَمْرِی، ما الإمامُ إلّا الحاکمُ بالکِتابِ

---

(۱) بحار الانوار۔ جلد ۲۵۔ صفحہ ۱۶۴ (۲) نہج البلاغہ فیض الاسلام صفحہ ۸۱
(۳) بحار الانوار ج ۲۵۔ صفحہ ۱۷۲ (۴) بحار الانوار جلد ۲۵۔ صفحہ ۱۷۲
(۵) نہج البلاغہ۔ فیض الاسلام، خطبہ ۵۔ صفحہ ۵۷

امام علیؑ فرماتے ہیں: ''مجھے اپنی جان کی قسم ہے کہ لوگوں کا امام وہی ہوسکتا ہے جو خدا کی کتاب کے مطابق حکم دیتا ہے۔(۱)

امام کی مہربانی

امام رضا علیہ السلام، امام کی صفات کے بارے میں یوں فرماتے ہیں:

أَشْفَقَ عَلَيْهِمْ مِنْ آبَائِهِمْ وَ أُمَّهَاتِهِمْ ۔ ''امام لوگوں پر ان کے والدین سے زیادہ مہربان ہوتا ہے۔(۲)

اور پھر فرماتے ہیں کہ امام کو عَالِمٌ بِالسِّيَاسَةِ(۳) سیاست سے واقف ہونا چاہیے تا کہ وہ اپنے اچھے اور بلند منصوبوں سے معاشرے کو منظم کر سکے اور ترقی دے سکے۔

امام کو قَائِمٌ بِالرِّيَاسَةِ(۴) ہونا چاہیے یعنی وہ اس بڑی خدائی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے۔

امام کو اتنا قابل ہونا چاہیے کہ وہ خلائق کی ضرورت کے مطابق تمام زبانوں اور لغات میں بات کر سکے يُكَلِّمُ النَّاسَ بِكُلِّ لِسَانٍ وَّ لُغَةٍ، ہر زبان اور لغت میں لوگوں سے گفتگو کر سکے۔(۵)

زہد

امام کی ایک صفت دنیا سے بے رغبتی اور اس کا زہد ہے۔

امام علی علیہ السلام نے پیوند لگے لباس کے بارے میں یوں فرماتے ہیں:

خدا کی قسم! میں نے اس لباس میں اتنے پیوند لگوائے ہیں کہ اب مجھے اس میں پیوند لگانے والے سے مزید پیوند لگوانے میں شرم آنے لگی ہے۔(۶)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: وَ اللّٰهِ مَا كَانَتْ لِي فِي الْخِلَافَةِ رَغْبَةٌ

---

(۱) الارشاد۔ شیخ مفید (۲) بحارالانوار۔ جلد ۲۵۔ صفحہ ۱۱۷ (۳) بحارالانوار۔ جلد ۲۵۔ صفحہ ۱۲۶
(۴) بحارالانوار۔ جلد ۲۵۔ صفحہ ۱۷۳ (۵) بحارالانوار۔ جل ۲۵، صفحہ ۱۴۱
(۶) نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۵۹

''خدا کی قسم مجھے خلافت کی خواہش اور رغبت نہیں ہے۔''(۱)

امام کو شک نہیں ہوتا

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: مَا شَکَکْتُ فِی الْحَقِّ مُذْ أُرِیتُهُ(۲)

''جس وقت سے مجھ پر حق واضح ہوا ہے پھر اس میں اب تک مجھے شک پیدا نہیں ہوا۔''(۳)

دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں: وَلاَ ضَلَلْتُ وَلاَ ضُلَّ بِیْ

''نہ آج تک میں بھٹکا ہوں اور نہ میرے ذریعے سے کوئی بھٹکا ہے۔''(۴)

امام پر رنج و راحت کا اثر نہیں پڑتا

امام ملامت کو خاطر میں نہیں لاتا: وَإِنِّی لَمِنْ قَوْمٍ لَا تَأْخُذُهُمْ فِی اللّٰهِ لَوْمَةُ لَائِمٍ

امام علیؑ فرماتے ہیں کہ: ''میں اس گروہ سے تعلق رکھتا ہوں جس پر بُرا بھلا کہنے والوں کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔''(۵)

امام کو آگے آگے چلنا چاہیے

مَنْ نَصَبَ نَفْسَهُ لِلنَّاسِ إِمَاماً فَلْیَبْدَأْ بِتَعْلِیمِ نَفْسِهِ قَبْلَ تَعْلِیمِ غَیْرِهِ، وَلْیَکُنْ تَأْدِیبُهُ بِسِیرَتِهِ قَبْلَ تَأْدِیبِهِ بِلِسَانِهِ(۶) ''جو کوئی اپنے آپ کو لوگوں کا امام ٹھہرائے اسے چاہیے کہ دوسرے کی تعلیم شروع کرنے سے پہلے اپنے نفس کی تعلیم شروع کرے اور زبان سے تربیت دینے سے پہلے اپنے عمل سے تربیت کا طریقہ اپنائے۔''

امام کو بے تکلف ہونا چاہیے

خداوند عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرماتے ہیں:

لوگوں سے کہہ دو کہ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا، نہ میں تکلف کرنے والا ہوں، نہ

(۱) نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۶ (۲) نہج البلاغہ۔ حکمت، ۱۷۵
(۳) نہج البلاغہ۔ حکمت، ۱۷۵ (۴) نہج البلاغہ۔ فیض الاسلام۔ صفحہ ۸۱۴
(۵) نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۰ (۶) نہج البلاغہ۔ فیض الاسلام۔ صفحہ ۱۱۰۷

تمہارے لیے کوئی دشواری پیدا کرنیوالا ہوں اور نہ تم سے نامعقول مطالبے کرنے والا ہوں۔ میں اپنے آپ کو کسی ایسی شے سے آراستہ نہیں کرتا جو حقیقت یا اصلیت میں موجود نہ ہو۔ میرے کام میں کوئی بناوٹ نہیں۔ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ (سورۂ ص۔ آیت ۸۶)

تکلف کی علامت یہ ہے کہ انسان آمادہ نہیں ہوتا کہ غیر معروف لوگوں کی دعوت قبول کرے یا اپنے غلط کام پر معذرت کرے یا جو بات نہیں جانتا وہ کسی سے پوچھ لے یا جب موقع آئے تو مشورہ کرے۔ جو شخص تکلف کرتا ہے وہ اپنے سے چھوٹے پر ظلم کرتا ہے اور اپنے سے بڑے کا رعب مانتا ہے۔

امام رواداری کرتا ہے لیکن خوشامد نہیں کرتا

ایک خدائی رہبر کو لوگوں کی تربیت کی خاطر ان سے رواداری تو کرنا چاہیے لیکن جرائم سے چشم پوشی اور ان کی چاپلوسی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ رواداری دین یا لوگوں کے دنیاوی معاملات کی اصلاح کے لیے حب دنیا اور خود اپنے منصب کی شان کی پروا نہ کرنا ہے لیکن چاپلوسی دین اور مکتب کے قوانین کے ایک حصے کو نظر انداز کرنا ہے اور یہ اپنی حیثیت کے تحفظ یا کسی دنیاوی مرتبے تک رسائی کے لیے ہے۔

مدارا کے معنی یہ ہیں کہ ہم کم ظرف، ٹیڑھے چلن والے اور بھگوڑے لوگوں کو معاف کر دیں اور ان کی غلط حرکات سے درگزر کریں تا کہ وہ مکتب کی جانب کھنچ آئیں لیکن چاپلوسی کا مطلب ہے کوئی مستقل طریقہ نہ رکھنا اچھے برے تمام گروہوں سے تعلق رکھنا خفیہ منصوبے تیار کرنا اور اپنے مفاد کی حفاظت کرنا۔ رواداری یا مُدارا کشادہ دلی سے پیدا ہوتا ہے لیکن چاپلوسی اپنی ذاتی کمزوری اور نفع کمانے کے خیال سے ہے اور چاپلوسی حرص کی وجہ سے کی جاتی ہے۔

امام تاریخ کے فلسفے سے واقف ہوتا ہے

امام علیؑ اپنے بیٹے امام حسنؑ سے یوں فرماتے ہیں: ''اے میرے بیٹے! اگرچہ میں نے قدما کے ساتھ عمر بسر نہیں کی ہے لیکن ان کی تاریخ اور ان کی یادگاروں، کوششوں، طریقوں اور کاموں کو

دیکھ کر اور ان پر غور کر کے ان کے متعلق اتنی معلومات اور واقفیت حاصل کر لی ہے کہ جیسے میں بھی ان میں سے ایک بن گیا ہوں۔ (۱)

منصب سے ناجائز فائدہ اٹھانا

قرآن اس سلسلے میں پیغمبر اکرمؐ کے متعلق یوں فرماتا ہے: کسی انسان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ خداوند تو اس کو کتاب، حکمت اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہتا پھرے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ بے شک بندگی خدا کے لیے مخصوص ہے اور بس (سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۷۹)

شکایت کی جانچ

امام علیؑ درخواستوں اور شکایتوں کو تحریری طور پر ترتیب دیتے تھے جس کی شکایت کی جاتی اسے عدالت میں بلاتے تھے اور اس سے باز پرس فرماتے اور اس کے مالی حساب کی پڑتال کرواتے تھے۔ آپ اکثر اپنے گورنروں سے فرماتے تھے۔ فَارْفَعَ اِلَیَّ حِسَابَ (۲) اپنا حساب اور کارکردگی کی یادداشت میرے پاس لاؤ اور اپنے کام کی تفصیل مجھے دکھاؤ۔

صبر اور یقین

امام کی ایک اور صفت اور شرط مشاہدہ، یقین اور ایمان ہے۔ قرآن اس بارے میں کہتا ہے:

''ہم نے بنی اسرائیل کے کچھ افراد کو اس وقت لوگوں کی ہدایت کے لئے منتخب کیا جب وہ صابر اور ثابت قدم تھے اور خدا کی نشانیوں پر بھی ایمان اور یقین رکھتے تھے یقین آسائش اور عصمت کا سرچشمہ اور باطنی تمام کمالات کا ضامن ہے۔ (سورۂ سجدہ۔ آیت ۲۴)

آزاد طریقہ

امام کو چاہیے کہ وہ ہر قسم کی غیر الٰہی قید اور تعلق سے آزاد رہے مثلاً قبیلے، نسل اور جماعت کی وابستگی سے دور رہے اور دوسرے تمام عناصر سے جو انسان پر اثر ڈالتے ہیں مبرّا رہے۔

(۱) نہج البلاغہ۔ وصیت ۳۱ (۲) نہج البلاغہ۔ مکتوب ۴۰۔ صفحہ ۴۱۲

اخلاص اور کسی سے مادی اُمید نہ رکھنا

امام علیؑ پانچویں خط میں جو نہج البلاغہ میں موجود ہے، آذربائیجان کے عامل کو لکھتے ہیں:

إِنَّ عَمَلَكَ لَيْسَ لَكَ بِطُعْمَةٍ وَلَكِنَّهُ فِي عُنُقِكَ أَمَانَةٌ (۱)

حقیقت میں تمہارا منصب اور کارکردگی تمہارے لیے ایک امانت اور ذمہ داری ہے۔ روزی کمانے، زندگی بسر کرنے اور آرام پانے کا وسیلہ نہیں ہے۔ قرآن نبیوں کا ایک خاصہ یوں دہراتا ہے کہ یہ بزرگ ہستیاں کسی سے مادّی امید نہیں رکھتی تھیں۔ (۲)

اسلام کے مفاد کی حفاظت

امام علیؑ اپنے جائز حقوق سے ہٹا دیے گئے لیکن انہوں نے صبر کیا وہ فرماتے تھے کہ اگر مسلمانوں کا کام خوبی کے ساتھ انجام پاتا ہے تو میں کچھ نہیں کہوں گا اور اپنے اوپر ظلم گوارا کرلوں گا۔ (۳) خدا کی قسم اگر تفرقے کا خدشہ نہ ہوتا تو میں اس راہ سے الگ دوسری راہ اختیار کر لیتا اور لڑ کر اپنا حق لے لیتا۔ (۴)

ابن عباس نے امام علیؑ سے کہا کہ آپ عمر کی مجلسِ مشاورت میں شریک نہ ہوں کیونکہ منصوبہ کچھ اس طرح بنایا گیا ہے کہ آپ کو عملی طور پر کاٹ دیا جائے، امام نے فرمایا چونکہ مجھے بلایا گیا ہے۔ اس لیے میں ضرور جاؤں گا کیونکہ میں محض مخالفت کو ناپسند کرتا ہوں اور یہ نہیں چاہتا کہ وہ مجلس میری وجہ سے ناقص ہو کر رہ جائے۔

---

(۱) نہج البلاغہ، نامہ ۵ صفحہ ۸۳۹۔ فیض الاسلام

(۲) سورۂ شعراء۔ ۱۰۹ تا ۱۸۰
حضرت نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، شعیب اور داؤدؑ کا قول نقل کرتا ہے جو فرماتے ہیں: ہم بجز خدا کے کسی سے اجر یعنی معاوضہ نہیں چاہتے۔

(۳) سیری در نہج البلاغہ۔ صفحہ ۱۸۲

(۴) نہج البلاغہ، خطبہ ۱۱۹

انتخاب کا طریقہ

رہبر اور امام کے تقرر کا طریقہ

آج کے معاشروں میں رہبر اور ذمہ دار منصب پر کسی فرد کے تقرر کا بہترین طریقہ انتخابات ہیں لیکن یہ بات بھی ظاہر ہے کہ انتخابات اس مسئلے کے حل کا ایک طریقہ تو ہوسکتا ہے لیکن یہ طریقہ ہر جگہ درست قرار نہیں پا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انتخابات حقیقتوں کو نہیں بدل سکتے۔ نہ درست کو نادرست اور نادرست کو درست کر سکتے ہیں۔ حق اگر حق ہے تو اپنے کم طرفداروں کے باوجود بھی باطل نہیں ہوسکتا اور باطل اگر باطل ہے تو اکثریت کی رائے کے باوجود حق نہیں بن سکتا۔ کوئی علمی اور عقلی دلیل یہ نہیں کہتی کہ اکیاون اشخاص کی منتخب کی ہوئی چیز انچاس آدمیوں کی چنی ہوئی شے سے بہتر ہوتی ہے۔ ہاں عمل کے معاملے میں اکثریت کی رائے ضرور مدنظر رکھی جاتی ہے لیکن کیا یہ سچائی اور حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے؟ نہیں۔ اصولی طور پر اسلامی حکومت اللہ کی بنائی ہوئی بنیادوں پر قائم ہے اور لوگوں کے لیے اس بارے میں (اکثریت اور اقلیت کی بنیاد پر) کسی قسم کا کوئی حق نہیں رکھا گیا کیونکہ یہ خدا کی حکومت ہے اور بس اس سے بہتر اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ خدا جو سب سے زیادہ جانتا ہے اور سب سے زیادہ مہربان بھی ہے۔ وہ خود انسانوں کے لیے امام مقرر کرے۔

دوسری جانب دیکھیے تو قرآن شریف میں اکثریت کی تقریباً اسّی مرتبہ برائی کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ سورۂ انعام کی آیت ۱۱۵ میں ہم پڑھتے ہیں:

''(اے رسولؐ!) اگر آپ ان کثیر لوگوں کی اطاعت کریں گے جو زمین پر بستے ہیں تو وہ آپ کو خدا کی راہ سے بھٹکا دیں گے کیونکہ وہ صرف اپنے وہم و گمان کی پیروی کرتے ہیں۔''

اسلام میں مشاورت کا تعلق نہ قانون سازی سے ہے اور نہ امام کے تقرر سے بلکہ اس کا تعلق سماجی احکام کے نفاذ سے ہے سچ کہیے کیا نماز کی تعداد رکعات میں مشورے کی گنجائش ہے؟ کیا

لوگ ٹھیکری کے گرد جمع ہو جائیں تو وہ موتی ہو جائے گی؟ اگر وہ سونے کو چھوڑ بیٹھیں تو کیا وہ ٹھیکری بن جائے گا؟

اس کے علاوہ شوریٰ سے متعلق آیتیں اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ اکثریت کی رائے معتبر ہوتی ہے جبکہ ہم مشورے سے خیالات کی زیادہ سے زیادہ تعداد نہیں بلکہ بہترین خیال اخذ کرنے کے معنی لیتے ہیں۔

تاریخ نے بار بار بتایا ہے کہ انتخابات میں لوگ اکثریت کی رائے سے کامیاب ہو گئے ہیں لیکن جلد یا بدیر اس قسم کے انتخابات کی غلطی سب پر آشکار ہو گئی۔

سچ تو یہ ہے کہ ہم جو غیب کا علم نہیں رکھتے اور آنے والے زمانے اور لوگوں کے باطن سے بے خبر ہیں کس طرح کسی شخص کے بارے میں سو فیصدی درست رائے رکھ سکتے ہیں؟

ہمارے سامنے ایسے لوگوں کی کتنی ہی مثالیں موجود ہیں جن سے بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں لیکن انہوں نے مایوس کر دیا اور ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جن پر نیکی کا گمان بھی نہیں ہوتا تھا لیکن وہ یکا یک تبدیل ہو کر سینکڑوں نیکیوں اور برکتوں کا سرچشمہ بن گئے۔ کیا فرعون کے کے نمک خوار جادوگر حضرت موسیٰؑ کی توہین کے لیے میدان میں نہیں اترے تھے جو یکا یک حضرت موسیٰؑ کے بہترین حمایتی بن گئے؟ کیا بلعم باعور عقلمند انسان نہیں تھا جو دنیا کی محبت میں اپنے کمالات سے ہاتھ دھو بیٹھا؟

انہیں باتوں کے سبب سے ہم کہتے ہیں کہ رہبر کا تقرر خدا کی طرف سے ہونا چاہیے کیونکہ وہ علم غیب رکھتا ہے اور لوگوں کے آنے والے حالات کو جانتا ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کسے رسالت کا منصب عطا کرے۔ اَللّٰهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ(۱)

یہ بات واضح ہو جانے کے بعد کہ مسئلہ امامت ایک اہم اعتقادی مسئلہ ہے جو معاشرے کی ہدایت کا ذریعہ اور نشوونما دینے والا ہے نیز ان کثیر روایات کے مطابق سچے امام کی پیروی کے بغیر

(۱) سورۂ انعام۔ آیت ۱۲۴

عبادت قبول نہیں ہوتی، چاہے انسان عمر بھر اور رات دن سخت قسم کی عبادت کرتا رہے۔

و الله،لو أنّ رجلا صام النّهار و قام الليل،ثمّ لقي الله-عزّ و جلّ-بغير ولايتِنا أهل البيت،لقيه الله و هو عنه غير راض أو ساخط عليه.(۱)

''خدا کی قسم! چاہے کوئی شخص دن کو روزہ رکھے اور رات بھر نماز پڑھا کرے لیکن جب تک وہ ہماری رہبری کو قبول نہیں کرے گا قیامت میں اس پر یا تو خدا کا غضب نازل ہوگا یا کم از کم خدا اس سے راضی نہیں ہوگا اور اس کے بعد کہ تاریخ میں رہبری کے مسئلے نے قوموں کی قسمت پر خاص اثر ڈالا ہے اور اس کے بعد کہ غفلت، شک، دھمکی اور لالچ کے راستے کھلے ہوئے ہیں اور لوگوں نے اپنے آپ کو جھوٹ موٹ کا اور جعلی رہبر اور امام بنالیا ہے اور جماعتوں کو تباہی کے سپرد کر کے بدقسمت بنادیا ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ آپ امام کو انتخابات کے ذریعے منتخب کیا جائے۔''

دنیا میں رہبر کے تقرر کے طریقے

دنیا میں لوگ یا تو بغاوت، طاقت، زور اور ظلم کے طریقے سے رہبری کا منصب حاصل کرتے ہیں یا کسی کمیٹی اور پارلیمنٹ کے ذریعے سے کسی شخص کا تقرر ہوتا ہے یا انتخاب اور رائے عامہ کے ذریعے سے یا جانشینی اور وراثت کے طریقے سے۔

لیکن بے عیب اور درست طریقہ وہی خدائی طریقہ ہے جس میں پیغمبروں جیسے معصوم رہبر خدا کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں۔

امام کا تقرر صرف خدا کی طرف سے ہوتا ہے

جب خدا نے حضرت ابراہیمؑ کی جان، مال اور بیوی وغیرہ کی جدائی جیسے حوادث سے آزمائش کر لی اور وہ ان تمام خدائی امتحانات میں کامیاب ہو گئے تو انہیں امامت اور رہبر کے منصب پر مقرر فرمایا۔ حکم الٰہی کی عبارت یہ تھی (اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا) میں نے تجھے لوگوں اور ان کے فائدے کے لیے امامت کے منصب پر مقرر کر دیا۔

(۱) بحار الانوار۔ جلد ۲۶۔ صفحہ ۱۹۰

اس اعلان میں جملہ (اِنِّیۡ جَاعِلُكَ) ''میں نے تجھے بنا دیا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کا تقرر خدا کے ہاتھ میں ہونا چاہیے اور بس۔

ناخوشگوار تجربے

اسی وجہ سے لوگوں کو غیر معصوم کے سپرد کرنا بھی ظلم ہے اور انسانیت کے درجے کی توہین ہے اور امام اور رہبر کی پہچان خود ایسے لوگوں کے سپرد کرنا بھی ان پر جفا ہے جو غیب کا حال نہیں جانتے ،جنہوں نے کوئی معمولی ترقی بھی نہیں کی ہے اور جن کی عقل ان کی آنکھوں میں ہے۔

ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ لوگ پوچھتے تھے: قرآن مکہ اور طائف کے دو مشہور آدمیوں پر کیوں نازل نہیں ہوا؟

وَقَالُوۡا لَوۡلَا نُزِّلَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡيَتَيۡنِ عَظِيۡمٍ

(سورۂ زخرف۔آیت ۳۱)

وہ لوگ سوچتے تھے کہ چونکہ فلاں شخص مشہور و معروف یا مالدار اور صاحبِ جائیداد ہے اس لیے وحی بھی اسی پر نازل ہونا چاہیے تو دیکھیے اکثریت کی سمجھ کا نمونہ ہے۔جب جناب طالوتؑ خدا کی طرف سے فوج کے کماندار مقرر ہوئے تو بہت سے لوگوں نے محض ان کی ناداری اور غریبی کی وجہ سے ان کی کمانداری قبول نہیں کی تھی۔(سورۂ بقرہ۔آیت ۲۴۷)

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ پیغمبرؐ نمازِ جمعہ کا خطبہ پڑھنے میں مشغول تھے کہ تجارتی مال کے آجانے پر ڈھول کی آواز بلند ہوئی مسجد میں موجود لوگ رسول اکرمؐ کا خطبہ چھوڑ چھاڑ کر ایک دم مال تجارت کی طرف بھاگ لیے اور خریداری میں لگ گئے اور مسجد میں سوائے چند آدمیوں کے کوئی باقی نہیں رہا۔یہ بھی لوگوں کی اکثریت کی سوچ اور سمجھ کا ایک خاص نمونہ ہے۔

مختصر بات یہ ہے کہ ہم اتنے تلخ تجربوں کے بعد امام کے تعین کے سے اہم مسئلے کو لوگوں کے سپرد کس طرح کر سکتے ہیں؟ یہ ہے دلیل منصبِ امامت کے متعلق ہمارے اس عقیدے کی کہ امام بھی پیغمبر کی طرح صرف خدا کی طرف سے مقرر ہو۔

ٹھیک راستہ

امام مقرر کرنے کے معاملے میں صحیح راستہ وہی ہے جو قرآن بیان کرتا ہے کیونکہ ہم امامت کو نبوت کی طرح ،امام کو پیغمبر کی طرح اور امام کی ضرورت کی دلیل کو پیغمبر کی ضرورتِ دلیل کی طرح سمجھتے اور مانتے ہیں۔امام کا کام بھی پیغمبر کی طرح انسانی معاشرے کی رہنمائی کرنا اور اسے ترقی اور نیکی کی راہ دکھانا ہے اس لیے اس آیت کو جو نبوت کے بیان میں ہم نے پیش کی تھی یہاں بھی پیش کرتے ہیں اور وہ آیت یہ ہے۔اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی (سورہ لیل۔آیت ۱۳) در حقیقت انسانوں کی ہدایت ہمارے ذمے ہے۔

چنانچہ جس طرح پیغمبر کا انتخاب خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور قرآنی آیات اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔(۱) اسی طرح امام کا تقرر بھی جو لوگوں کی ہدایت اور خدائی وعدوں سے متعلق ہے، خدا دہی کی طرف سے ہونا چاہیے۔

نامزدگی ہی صحیح راستہ ہے

غدیر خم کے واقعے میں ملتا ہے۔ ۱۰ھ جو رسول اکرمؐ کی عمر کا آخری سال تھا، جب اس میں یہ طے ہوا کہ آنحضرتؐ حج کے لیے مدینے سے مکے جائیں تو مسلمانوں کو جیسے ہی اس بات کی خبر ہوئی وہ کوشش کرنے لگے کہ اس سفر میں رسول اکرمؐ کے ساتھ حج کے مراسم بجالائیں چنانچہ آنحضرتؐ کے ہمراہ ایک بہت بڑا قافلہ مکے پہنچا۔وہ لوگ حج سے فارغ ہوکر مدینے کو پلٹ رہے تھے کہ ایک ایسے چوراہے پر پہنچے جہاں سے لوگوں کے قافلے ایک دوسرے سے الگ ہو جایا کرتے تھے، یہاں سے ایک راستہ شمال میں مدینے کی طرف ،ایک مشرق میں عراق کی طرف ،ایک مغرب میں مصر کی جانب اور ایک راستہ جنوب میں یمن کی طرف نکلتا تھا۔پیغمبر اکرمؐ نے حکم دیا، سب لوگ یہیں ٹھہر جائیں۔

---

(۱) اگر اصطفاء، بعثت اور جَعَلَ کی آیات لیکر ان کی جانچ کی جائے تو ہمارا بیان اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔

اس جگہ کا نام غدیر خم تھا۔ جمعرات کا دن تھا اور بقرعید کو آٹھ دن ہو چکے تھے۔ آپ کے حکم کے مطابق سب لوگ رک گئے۔ آگے نکل جانے والوں کو ہدایت دی گئی کہ واپس آ جائیں اور انتظار کریں تا کہ پیچھے رہ جانے والے بھی یہاں پہنچ جائیں۔ دھوپ سخت تھی۔ تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا۔ ریت سے پاؤں جھلسے جا رہے تھے۔ سب نے پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کی اور پھر باہم جدائی کے اس مقام پر چوراہے کے ایک طرف سب سے اہم پیغام شروع ہوتا ہے۔

اونٹوں کے پالان ایک پر ایک چن کر پیغمبر اکرمؐ کے لیے منبر بنایا گیا۔ آپؐ منبر پر تشریف لے گئے۔ آپؐ نے فرمایا کیا آپ میری آواز سن سکتے ہیں؟

سب نے جواب دیا: جی ہاں!

اس کے بعد آپؐ نے خدا کی تعریف کی۔ توحید، رسالت اور قیامت کا اقرار کیا اور لوگوں سے اپنے کام کے بارے میں پوچھا۔ سب نے آپ کے کام کی تعریف کی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا:

موت اپنے کام میں مصروف ہے اور قریب ہے کہ میں بلا لیا جاؤں، میں بھی خدا کے بلاوے پر لبیک کہتا ہوں۔ میں بھی جوابدہ ہوں اور تم بھی جوابدہ ہو۔ اس کے بعد آپ نے لوگوں سے توحید، رسالت اور قیامت کا اقرار لیا اور پھر فرمایا:

''میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک قرآن اور دوسرے میرے اہل بیتؑ۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوں گے۔ تم اس بات کی کوشش کرتے رہنا کہ نہ ان سے آگے نکلو، نہ پیچھے رہو۔'' اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے چاروں طرف نگاہ کی۔ علیؑ کو دیکھ کر انہیں منبر پر بلایا اور اُن کے ہاتھ کو اتنا بلند کیا کہ سب نے انہیں پہچان لیا اور آپ نے پکار کر کہا: مسلمانوں میں سب سے لائق آدمی کون ہے سب نے جواب دیا: خدا اور پیغمبر اکرمؐ بہتر جانتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ جس کا میں مولا اور رہبر ہوں علیؑ بھی اس کے مولا اور رہبر ہیں۔ حضورؐ نے اس بات کو دہرایا اور علیؑ کو دوست رکھنے والوں کے حق میں دعا کی اور علیؑ کو دشمن رکھنے والوں پر نفرین کی۔''

حقیقی شیعہ

خراسان کے ایک شخص نے امام صادقؑ کے سامنے مسلح جدوجہد کی تجویز پیش کی اور کہا کہ آپ کے پاس ایک لاکھ افراد ہیں۔ امام نے ان کی جاں نثاری کا اندازہ کرنے اور جانچنے کے لئے اس سے کہا: تم اس جلتے تنور میں اتر جاؤ اس نے کچھ پس وپیش کی۔ اسی بیچ میں امام کا ایک اور پیرو آیا اور اسنے امام کی خدمت میں سلام عرض کیا۔ آپ نے اس سے فرمایا: اس جلتے تنور میں اتر جاؤ۔ وہ نہایت خوشی سے اتر گیا۔ امام نے خراسانی کی طرف منہ کر کے کہا ہمارے پاس تنوری شیعہ چند ایک ہی ہیں کہ ہم ان سے جو کچھ کہتے ہیں وہ مان لیتے ہیں اور اعتراض نہیں کرتے، باقی تنوری شیعہ نہیں ہیں۔ ہاں دعوے اور عمل کے درمیان بہت فرق ہوتا ہے۔[1] ادھر حضرت کا وہ جاں نثار شیعہ تنور میں نہیں جلا (بالکل اسی طرح جس طرح حضرت ابراہیمؑ آگ میں نہیں جلے تھے)

ہم حدیث میں پڑھتے ہیں۔ جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں شیعہ علیؑ ہوں لیکن اپنے عمل میں وہ دوسروں کی رسیاں پکڑتا ہے، وہ جھوٹ بولتا ہے۔

كَذَبَ مَنْ زَعَمَ أَنَّهُ يَعرِفُنا وهُوَ مُتَمَسِّكٌ بِعُروَةِ غَيرِنا.

معصوموں کی امامت کیسے کمزور پڑ گئی

امام صادقؑ کی حدیث میں ہم یہ پڑھتے ہیں کہ اگر بنی امیہ ایسے آدمی پیدا نہ کرتے جو اُن کی باتیں لکھتے، مال غنیمت جمع کرتے اور ان کی خاطر لڑائیاں لڑتے تو بنی امیہ ہمارا حق ہم سے چھین نہیں سکتے تھے۔ ہاں امامت کی کمزوری قوت ارادی نہ رکھنے والے وابستگان کے ہار مان

(۱) بحار الانوار۔ جلد ۱۱۔ صفحہ ۱۳۹

لینے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ (۱)

ایسے بہت سے لوگ ہیں جن کے دل معصوم اماموں کے ساتھ ہیں لیکن وہ خوف یا لالچ کی وجہ سے دوسروں کے پٹھو بن جاتے ہیں۔

زیادتیاں

امامت کے مسئلے پر اماموں کے مکتب اور ان بزرگواروں کے سچے اطاعت گزاروں پر طرح طرح کے ظلم ہوئے ہیں۔

۱۔ معاشی ظلم

امام علیؑ سے فدک لے کر جس سے اس وقت کافی آمدنی ہوتی تھی ان کی مالی طاقت ختم کر دیگی۔

۲۔ کردار کُشی

ہمارے مظلوم امام پر قسم قسم کی تہمتیں لگائی گئیں اور حد یہ ہوگئی کہ جب شام کے لوگوں نے یہ سنا کہ امام علیؑ کوفہ کی مسجد میں شہید ہو گئے تو کہنے لگے: علیؑ مسجد میں کیا کرنے گئے تھے؟ کیا وہ نماز پڑھنے والوں میں سے تھے!

۳۔ دشمن پیدا کرنا

امام کے دشمنوں کو بڑا بنا کر اور ان کے مخالفوں کو قوت پہنچا کر آپ کو کمزور کر دینے کا انتظام کیا گیا۔

۴۔ عقلی اور فکری ظلم

حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ (ہمارے لیے قرآن ہی کافی ہے) کا نعرہ لگا کر رسول اکرمؐ کی حدثوں کے بیان کو روک دیا گیا۔ امام معصومؑ کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگا دی اور لوگوں کو علم کے اصلی سرچشموں سے محروم کر دیا۔

---

(۱) بحار الانوار ج ۴۷۔ صفحہ ۳۸۳

۵۔ خیر خواہوں کو محروم کر دینا

اسلامی مالیات میں سے رسول اکرمؐ کے قریبی عزیزوں اور اہل بیتؑ کا حصہ خارج کر دیا گیا۔

۶۔ جھوٹ گھڑنا

ابو ہریرہ جیسے لوگوں کے ذریعے جعلی حدیثیں گھڑنے کا کام شروع کر دیا گیا چنانچہ بنی امیہ کی تعریف اور بنی ہاشم کی مذمت کے علاوہ دیگر مسائل کے بارے میں اتنی جھوٹی حدیثیں گھڑی گئیں کہ ایک جماعت کے لیے جھوٹ اور سچ کی پہچان کا راستہ مشکل بنا دیا۔

۷۔ تحریف اور توجیہہ

امامت اور رہنمائی کے مسئلے کے متعلق صاف اور واضح بیانات کو اتنا توڑا مروڑا اور ان کی ایسی ایسی تشریح اور تاویل کی کہ وہ بالکل بے کار ہو گئے۔

۸۔ طریقے کی تبدیلی

معصوم کی امامت کے مسئلے کو جو خدائی عہد و پیمان تھا اتنا نیچے گرایا کہ اسے یزید کی سی حکومت کی سرحد تک پہنچا دیا۔

۹۔ عالم کی جگہ جاہل

تمام خدائی قدروں اور پیمانوں کو مہمل بنا دیا۔ ہر شخص نے طاقت اور ہر بنیاد پر جدھر چاہا معاشرے کا رُخ پھیر دیا۔ ایسے رہبر کی جگہ پر جو کہتا تھا (سَلُوْنِیْ) کہ جو چاہو پوچھ لو میں اس کا جواب دوں گا، وہ لوگ ایسے رہبر کے پیچھے چل دیے جو کہتا تھا (اَقِیْلُوْنِیْ) مجھے چھوڑ دو میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ پیغمبر اکرمؐ کے علم کے دروازے کے بجائے ایسے شخص کے پیچھے چل دیے جو کتنی ہی بار طرح طرح کے مسائل میں مجبور ہو کر علیؑ سے مدد مانگنے لگتا تھا اور کہتا تھا کہ اگر علیؑ میری مدد کو نہ پہنچتے اور مجھے مشکلوں سے نہ نکالتے تو میری تباہی یقینی تھی۔

۱۰۔ بہانے اور دُشمنیاں

ایک بہانہ بنایا گیا ہے کہ علیؑ نوجوان ہیں، ہنسٹو رہیں۔ اکثر مسلمان ان سے خیبر، بدر، احد اور حنین کی لڑائیوں کے سلسلے میں بہت پرانا بیر رکھتے ہیں کیونکہ انہوں نے آج کے بہت سے مسلمانوں کے کافر باپوں کو پیغمبر اکرمؐ کے حکم سے ان لڑائیوں میں مار ڈالا تھا۔ ہاں ان دشمنیوں، کینوں اور بہانوں نے امام معصومؑ کو گھر میں بٹھا دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپ نے فرمایا مجھ پر پہلے دن سے ہی ظلم کیا گیا۔ (۱)

۱۱۔ خود امام ایک طرف ہٹ گئے

سب سے اہم بات یہ ہے جو وہ کہتے ہیں کہ امامؑ نے علمی اور معنوی رہبری پر قناعت کر لی تھی اور سیاسی اور فوجی رہبری دوسروں کے لیے چھوڑ دی تھی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا پوری کتاب نہج البلاغہ میں امام علیؑ کی پکاریں صرف اس لیے تھیں کہ لوگ آئیں اور امام ع سے مسئلہ دریافت کریں؟ کیا مسئلہ پوچھنے کے لیے بیعت کی ضرورت پڑتی ہے؟ امام نے دسیوں بار اپنے سیاسی حق کے تلف ہونے کی شکایت کی ہے۔ اس بات کی شکایت نہیں کی کہ لوگ مجھ سے علمی سوال کیوں نہیں کرتے؟ لوگ امام سے علمی سوال کرنے لیے تو مجبور تھے اور کرتے رہتے تھے۔

❁❁❁❁

معاد

فطری دلیلیں

اگرچہ کچھ لوگ زبان سے تو معاد کا اقرار نہیں کرتے لیکن لاشعوری طور پر وہ اپنی روح کی گہرائی میں انسان کی اذیت کو محسوس کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ از خود ایسے آثار ظاہر کرتے ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ موت اور جسم کے گلنے سڑنے کے باوجود انسان اور اس کی حقیقی شخصیت کو نیست و نابود ہو جانے والی چیز سمجھنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ ہم ذیل میں ان آثار کی کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ معاد کا انکار کرنیوالے سب لوگ اپنے بزرگوں کی قبروں کا احترام کرتے ہیں۔

۲۔ یہ لوگ سڑکوں، اداروں، مدرسوں اور یونیورسٹیوں کے نام اپنی مُردہ شخصیتوں کے نام پر رکھتے ہیں۔

۳۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ مرنے کے بعد ان کی نیک نامی باقی رہے۔

۴۔ یہ لوگ اپنی اولاد کے نام اپنے بزرگوں کے ناموں پر رکھتے ہیں۔

۵۔ یہ لوگ کبھی کبھی اپنے مُردوں کی ممیاں بناتے ہیں تا کہ وہ گلنے سڑنے سے محفوظ رہیں۔

اگر معاد سے انکار کرنیوالے موت کو انسان کی فنا سمجھتے ہیں تو ان کے اس قسم کے افعال کی کیا وجہ ہے۔ جب وہ لوگ مرنے کو فنا سمجھتے ہیں، تو پھر قبر پر پھول کیوں چڑھاتے ہیں۔ بیشک یہ سب باتیں اس امر کا پتا دیتی ہیں کہ معاد کے مخالف بھی اپنے دل میں انسان کی روح اور شخصیت کی بقا پر ایک (کمزور) قسم کا ایمان ضرور رکھتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی شخصیت موت کے

ساتھ ساتھ ختم نہیں ہوجاتی۔

ہاں! انسان اپنے دل میں بقا کا احساس رکھتا ہے اور کسی نہ کسی طرح تاریخ میں نیک نامی کو حوصلہ افزائی کا ذریعہ تصور کرتا ہے۔

انسان کے ہر فطری احساس کا جواب دو طرح سے دیا جاسکتا ہے:

۱۔ وقتی، عارضی اور جھوٹا جواب۔

۲۔ دائمی، پکا اور سچا جواب۔

مثال: ایک پیاسے شخص کی رہنمائی صاف اور خالص پانی کی طرف کی جاسکتی ہے اور اسے سراب بھی دکھایا جاسکتا ہے۔

غرض کہ تمام فطری احساسات کو دو طرح سے سہارا دیا جاسکتا ہے۔ اصلی اور مستقل سہارا بناوٹی اور عارضی سہارا۔ امام علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۴۷ میں فرماتے ہیں: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس لئے آئے تھے کہ لوگوں کو بتوں کی پوجا سے ہٹا کر خدا کی عبادت کی طرف اور مخلوق کی اطاعت سے ہٹا کر خالق کی اطاعت کی طرف لائیں۔ بے شک انسان کے دل میں عبادت اور محبت کی جڑ اور بنیاد موجود ہے۔ اگر اس کے اس اندرونی میلان کو حق کی طرف نہیں موڑا جاتا تو وہ توہمّات میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں انبیاء کیا کہتے ہیں۔

۱۔ انسان بلاوجہ پیدا نہیں کیا گیا۔(۱)

۲۔ انسان کی پیدائش کا مقصد بہت بڑا ہے اور وہ ہے تمام راستوں میں سے خدا کی راہ اور تمام اطاعتوں اور بندگیوں میں سے خدا کی اطاعت اور بندگی کا انتخاب کرنا۔(۲)

۳۔ اس غرض سے کہ انسان اپنے مقصد میں کامیاب ہو اسے تمام فطری اختیارات دیدیے گئے اور تمام مظاہر قدرت اس کے تابع کردیے گئے۔(۳)

---

(۱) سورۂ مومنون، آیت ۱۱۵ (۲) سورۂ زاریات، آیت ۵۶ (۳) سورۂ حج، آیت ۶۵

۴۔ ہم نے اسے خبردار کر دیا کہ تیرے ہر اچھے اور برے کام کا حساب ہوگا، چاہے وہ جس حال اور جس مقدار میں بھی سرزد ہو۔ (۱)

۵۔ انسان اپنے اعمال کا قیدی ہے۔ (۲)

۶۔ انسان کے کان سے سنی جانے والی اور آنکھ سے دیکھی جانے والی باتوں اور دل میں آنے والے خیالوں کی بھی پوچھ گچھ ہوگی۔ (۳)

۷۔ خدا نیک کام کرنیوالوں کے اجر کو ضائع نہیں ہونے دیگا۔ (۴)

یہ وہ نظریات ہیں جو انبیاءؑ قیامت کے سلسلے میں بطورِ وضاحت پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر بات کے ساتھ ایک عقلی دلیل بھی موجود ہے جس پر ہم آگے چل کر غور کریں گے لیکن اس وقت یہ دیکھنا بہتر ہے کہ بنیادی طور پر معاد (واپسی) ہوگی بھی یا نہیں یعنی یہ بات عقل کی رو سے ناممکن تو نہیں ہے۔ پس جب ہم یہ سمجھ لیں کہ ایسا ہونا ممکن ہے تو پھر یہ دیکھیں گے کہ معاد کی دلیل کیا ہے کیونکہ اس کا صرف ممکن ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ کوئی بھی ممکن کام جب تک کہ اس کی دلیل اور سبب موجود نہ ہو واقع نہیں ہوسکتا۔ تیسرے مرحلے پر یہ بحث ہوگی کہ آیا معاد کے لیے کوئی رکاوٹ تو نہیں ہے۔

مردوں کا زندہ ہونا ناممکن نہیں

آج تک کوئی شخص معاد کے واقع نہ ہونے کی کوئی دلیل پیش نہیں کر سکا معاد کے مخالفین جو واحد راگ الاپتے رہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک مُردہ انسان جس کے ذرّات گل سڑ چکے ہوں وہ دوبارہ کیسے زندہ ہوسکتا ہے؟

اس بارے میں عقل اور قرآن کا جواب یہ ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے اور یہ کام انہونا نہیں ہے۔ یہ بات تصور میں بھی آتی ہے اور ہم رات دن برابر مردوں کے زندہ ہونے کی مثالیں اپنی آنکھوں

---

(۱) سورۂ زلزال۔ آیت ۷۔۸ (۲) سورۂ مدثر، آیت ۴۲

(۳) سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۳۶ (۴) سورۂ توبہ، آیت ۱۲۱

سے بھی دیکھتے رہتے ہیں۔ امام محمد تقی علیہ السلام فرماتے ہیں: سونا اور جاگنا ایک بہترین مثال ہے جس سے ہم مرنے اور جی اٹھنے کے مسئلے کو سمجھ سکتے ہیں۔ موت ایک لمبی اور گہری نیند سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس کی ایک اور مثال درختوں کی بہار، خزاں اور نباتات کا زندہ اور مُردہ ہونا ہے جیسے ہم سورۂ فاطر میں پڑھتے ہیں: وہ خدا ہی ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے تاکہ وہ بادل کو اٹھائیں۔ پھر وہ بادلوں کو خشک علاقوں اور شہروں کی طرف روانہ کرتا ہے۔ تب بارش برسنے کے بعد وہ اس (خشک سالی کے مارے ہوئے) مُردہ شہر کو زندہ کرتا ہے۔ اس کے بعد خدا فرماتا ہے: مردہ کا زندہ ہونا بھی درختوں اور نباتات کے زندہ ہونے کی طرح ہے۔ (۱)

ایک دوسری جگہ فرماتا ہے: ہم نے بارش سے (بے آب وخشک) مُردہ شہر کو زندہ کر دیا۔ قیامت میں تمہارا خروج (جی اٹھنا) بھی اسی طرح ہوگا۔ (۲)

غرض ہر دن رات اور ہر فصل اور ہر سال میں مردہ سے زندہ ہونے کی مثالیں، ہماری آنکھوں کے سامنے آتی ہیں جو مُردہ کے زندہ ہونے کے مسئلے کو اس قدر مشکل ہونے کے باوجود ہمارے لیے آسان اور قابل فہم بنا کر پیش کرتی ہیں۔

قرآن کا ایک یادگار واقعہ

ایک شخص نے کسی دیوار میں دبی ہوئی ایک ہڈی کرید کر نکالی اور اس کو پیس کر برادہ بنا دیا۔ پھر ایک غصّے سے رسول اکرمؐ سے کہنے لگا: اس گلی سڑی اور چورا چور ہڈی کو کون زندہ کر سکتا ہے؟ خدا نے اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیا کہ اس سے کہہ دیجئے، وہی خدا جس نے اسے پہلی بار پیدا کیا تھا۔ اس کے ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد بھی اسے دوبارہ پیدا کر سکتا ہے۔ (۳)

یہ لوگ جو مُردوں کے بکھرے ہوئے اجزا کے زندہ ہونے کو اس قدر عجیب سمجھتے ہیں، ان کی پہلی پیدائش پر کیوں شک نہیں کرتے کیونکہ پہلی بار پیدا کرنا تو دوبارہ پیدائش سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ ایک ہوائی جہاز کا پہلی بار بنانا زیادہ مشکل ہے یا اسے کھول کر اس کے پرزے الگ الگ

(۱) سورۂ فاطر۔ آیت ۹ (۲) سورۂ قٓ، آیت ۱۱ (۳) سورۂ یٰسٓ، آیت ۷۹ تا ۸۰

کر کے پھر سے انہیں جوڑنا؟

معاد کے ممکن ہونے میں دوسری مثالیں

اس بات کے ثبوت میں کہ مُردوں کا زندہ ہونا غیر ممکن نہیں ہے، قرآن کریم میں بہت سی مثالیں دی گئی ہیں۔ من جملہ ان کے وہ حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو واقعات بیان کرتا ہے۔ ہم یہاں انکا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

پہلا واقعہ:

حضرت عزیر علیہ السلام (۱) ایک سفر میں کسی اجڑی ہوئی بستی سے گزر رہے تھے، تب وہ (انکار سے نہیں) حیرت سے بولے: خدا انہیں مرنے کے بعد کیونکر زندہ کر سکے گا؟ خدا نے ان کو اسی جگہ سو سال تک مردہ رکھا اور پھر زندہ کر کے پوچھا: تم یہاں کتنے عرصے تک رہے؟ پیغمبر نے جواب دیا: ایک یا آدھے دن تک۔ خدا نے فرمایا: تم یہاں سو سال تک رہے ہو۔ اب تم اپنی سواری کے گدھے اور اس کھانے کو دیکھو جو تمہارے پاس تھا۔ پھر خدا کی اس قدرت کو سمجھنے کی کوشش کرو کہ تمہارا گدھا کس طرح مرا اور گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہو گیا ہے، لیکن وہ غذا جسے ایک دو دن میں گل سڑ جانا چاہیے تھے، سو سال سے صحیح سلامت موجود ہے۔ اب تم مردوں کے زندہ ہونے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے اس گدھے کی ریزہ ریزہ ہڈیوں پر نظر ڈالو جسے ہم تمہاری آنکھوں کے سامنے زمین پر کھڑا کر کے، اس کا گوشت، کھال اور روح اس کو واپس کرتے ہیں تا کہ آنے والوں کے لیے یہ ایک عبرت اور نشانی ہو۔

حضرت عزیر علیہ السلام نے جیسے ہی گدھے کا زندہ ہونا اور سو سال تک کھانے کا نہ سڑنا دیکھا تو فوراً کہا: میں جانتا ہوں کہ خدا ہر کام کی طاقت رکھتا ہے۔

(۱) بعض لوگوں نے ان پیغمبر کا کوئی اور نام بھی لیا ہے لیکن مشہور حضرت عزیر علیہ السلام ہی ہیں۔

دوسرا واقعہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک دریا کے پاس گزر رہے تھے کہ آپ نے وہاں ایک لاش دیکھی جس کا ایک حصہ پانی میں اور دوسرا خشکی پر تھا۔ دریائی اور صحرائی جانور اور پرندے اس پر ہجوم کیے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر قسم کا جانور اس کا ایک ایک ذرّہ کھا رہا تھا۔ آپ نے جیسے ہی یہ منظر دیکھا، خدا سے پوچھا کہ قیامت کے دن تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا (کیونکہ لاش کے ذرات سمندر اور صحرا اور ہوا میں بکھر چکے تھے اور اس کے جسم کا ہر حصہ دوسرے جانور کے جسم کا حصہ بن چکا تھا) خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا: کیا تم معاد اور میری قدرت پر ایمان نہیں رکھتے؟ انہوں نے جواب دیا: کیوں نہیں، لیکن میں آنکھوں سے دیکھ کر اطمینانِ قلب حاصل کرنا چاہتا ہوں (ہاں بحث اور منطق سے صرف عقل کی تسلی ہوتی ہے اور تجربے اور مشاہدے سے دل کی)۔

خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا: چار قسم کے پرندے لو۔ انہیں ذبح کر کے ان کا گوشت آپس میں ملا دو اور اس کو مختلف پہاڑوں کے اوپر رکھ دو۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے ان پرندوں کو بلاؤ۔ پھر دیکھو کہ ان کے باہم ملے ہوئے ذرات میں سے کچھ ذرات کس طرح جدا ہو کر پرندے کی پہلی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک؛ ایک مرغا، کبوتر، مور اور کوّا پکڑ کر ذبح کیا اور ان کے گوشت کو کاٹ کر ملایا اور دس پہاڑوں کی چوٹیوں پر رکھ دیا۔ اس کے بعد انہوں نے ان میں سے جس جس پرندے کو بلایا، اس کے گوشت کے ذرات جو ہر پہاڑ کی چوٹی پر تھے باہم مل گئے اور آپ کی آنکھوں کے سامنے سالم پرندے کی شکل میں ڈھل گئے۔ (۱)

ہم اس بات کی کچھ اور آسان مثالیں پیش کرتے ہیں کہ بکھرے ہوئے ذرات سے ایک وجود کس طرح بن جاتا ہے۔

---

(۱) سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۶۰

۱۔ گائے چارہ کھاتی ہے۔ چارے کے ذرات سے دودھ نکلتا ہے۔
۲۔ انسان روٹی کا ایک ٹکڑا کھاتا ہے جس سے آنسو، خون ہڈی، بال، ناخن اور گوشت بنتا ہے۔
۳۔ بہت سے کپڑے اس تار سے بنتے ہیں جو انسان نے پٹرول سے نکالا ہے۔
۴۔ جب دھات پگھل جاتی ہے تو اس کے اندر سے پھین باہر نکل آتے ہیں۔
۵۔ دہی کو بلوئیں تو مکھن کے بکھرے ہوئے ذرّات یکجا ہو کر اس کی سطح پر آجاتے ہیں۔

آپ یہ بات کیوں تسلیم کرتے ہیں کہ گائے کے ہاضمے کا کارخانہ چارے سے دودھ نکال سکتا ہے، انسان پٹرول سے ریشہ نکال سکتا ہے اور آپ دہی کو بلو کر مکھن کے بکھرے ہوئے ذرات کو یکجا کر سکتے ہیں لیکن جب آپ یہ سنتے ہیں کہ خدا زمین کو حرکت دیگا۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (سورۂ زلزال۔آیت ۱) تو گلی سڑی ہڈیوں کے ذرات جہاں کہیں بھی ہوں گے اکٹھے ہو جائیں گے، آپ اسے نہیں مانتے۔

کچھ اور آسان اور چھوٹی چھوٹی آیتیں ہم یہاں پیش کرتے ہیں:

خدا فرماتا ہے: ہم نے جس طرح تم کو ابتدا میں بنایا تھا اسی طرح تم پھر زندہ ہو جاؤ گے۔ (سورۂ اعراف۔آیت ۲۹)

اور فرماتا ہے: اے معاد سے انکار کرنیوالو! تم اپنی پہلی پیدائش کو تو جانتے ہو، پھر بھی سبق نہیں لیتے اور ضد کرتے ہو۔ (۱) اور ہم پڑھتے ہیں کہ: انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے، وہ اس اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا ہوا تھا جو کمر اور پسلیوں کے بیچ سے نکلتا ہے۔ بے شک جس خدا نے تمہیں اس پانی سے پیدا کیا ہے وہ انسان کو دوبارہ زندہ کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔ (۲) وہ یہ بھی فرماتا ہے: کیا وہ خدا جس نے تمہیں نطفے سے پیدا کیا ہے مردوں کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا۔ (۳)

---

(۱) سورۂ واقعہ، آیت ۶۱
(۲) سورۂ طارق، آیت ۴ تا ۸
(۳) سورۂ قیامت، آیت ۴۰

وہ مزید فرماتا ہے: کیا ہم پہلی خلقت سے تھک کر مجبور ہو گئے ہیں جو یہ لوگ دوبارہ پیدائش کے بارے میں شک اور شبہے میں پڑ گئے ہیں۔ (۱)

کیا واقعی اگر کوئی راج تمہارے لیے خوشنما مکان بنائے اور پھر کہے کہ میں اس گھر کو ڈھا کر دوبارہ بناؤں گا تو تم کو شک کرنا چاہیے؟

پھر فرماتا ہے: کیا تم نہیں دیکھتے کہ جس خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ اسی طرح انسان کو بھی پیدا کر سکتا ہے؟ (۲)

اور فرماتا ہے: کیا معاد سے انکار کرنے والے کو یہ یاد نہیں کہ ہم نے اسے ابتدا میں پیدا کیا تھا جبکہ وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ (۳)

اگرچہ ہم قرآن سے دلیلیں دے رہے ہیں تاہم قرآن ہماری عقل اور فکر کو سوچنے کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے؛ کیا تم لوگوں کے لیے جو برابر رات دن، سال کے بارہ مہینے اس خدا کے کام کے نمونے دیکھتے رہتے ہو اب بھی حیرت و استعجاب کی گنجائش ہے؟

البتہ ہر ممکن کام، امکان کے علاوہ ایک سبب بھی چاہتا ہے، ہم اس مقام پر انشاء اللہ مختصر طور پر معاد کے اسباب بیان کریں گے کیونکہ اس سلسلے میں تفصیل سے کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

معاد کی پہلی دلیل: خدا کا عدل

معاد کے واقع ہونے کی کچھ ایسی پکی دلیلیں پیش کی جا سکتی ہیں جو عقل اور قرآن نے بیان کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب خدا عادل ہے تو پھر معاد بھی ہونا چاہیے۔ اگر معاد نہ ہو تو خدا کی عدالت پر حرف آتا ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ خدا اور انبیاءؑ کے احکام کے سامنے انسانوں کے دو گروہ ہو جاتے ہیں یعنی موافق اور مخالف۔ قرآن سورۂ تغابن میں اس حقیقت کو یوں فرماتا ہے: تم میں سے کچھ تو ایمان لے آئے اور کچھ کافر ہو گئے۔

---

(۱) سورۂ ق، آیت ۱۵ (۲) سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۹۹

(۳) سورۂ مریم، آیت ۶۷

دوسری طرف یا تو دنیا میں اعمال کا بدلہ ملتا ہی نہیں یا پھر سزاؤں کی کمی کے باعث ان کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ چنانچہ جلد یا بدیر اچھے برے سبھی لوگ اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اب اگر حساب کتاب اور سزا جزا کسی دوسری جگہ، مثلاً قیامت میں نہ ہو اور مرنے کے ساتھ ہی سب کچھ مٹ جائے تو پھر خدا کا انصاف کیا ہوگا؟ ہاں تو جب خدا عادل ہے اور اس دنیا میں عمل کی جزا بھی نہیں ہے تو پھر کسی دوسری جگہ پر پاداش ضرور ملنا چاہیے۔ اب ہم ایک سوال اور اس کا جواب نقل کرتے ہیں۔

سوال: خدا دنیا میں پاداش کیوں نہیں دیتا؟ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ معاملہ نقد یعنی فوراً ہو جاتا اور ہر نیک و بد کا حساب اسی دنیا میں چک جاتا۔ یوں پھر ہمارے لیے قیامت کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی؟ اس سوال کے بہت سے جوابات ہو سکتے ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم مختصر طور پر اشارہ کرتے چلیں گے۔

پہلا جواب: چونکہ دنیا میں دی جانے والی سزا دوسروں پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اس لئے گویا وہ ایک طرح کا ظلم ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے: فرض کیجیے کہ میں نے کسی کے منہ پر ایک تھپڑ مارا اور خدا نے مجھے اسی دنیا میں سزا دیکر میرا ہاتھ مفلوج کر دیا۔ جب میں گھر جاتا ہوں تو میرے عزیز میرا مفلوج ہاتھ دیکھتے اور کڑھتے ہیں حالانکہ میرے عزیزوں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔

دوسرا جواب: اگر خدا دنیا میں ہی جزا اور سزا دینے لگے تو لوگ خوف یا لالچ سے نیک بن جائیں لیکن یہ نیکی مجبوری کا نتیجہ ہوگی جس کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی۔ اصل نیکی اور اچھائی یہ ہے کہ انسان آزاد رہے اور پھر گناہ نہ کرے۔

اسلام میں قدر و قیمت کا معیار

بنیادی طور پر قرآن ان لوگوں کی زیادہ تعریف کرتا ہے جو حق اور باطل کے دوراستوں میں سے ان دلکشیوں کے باوجود جو باطل میں ہوتی ہیں۔اپنی نفسانی خواہشات کو دبا کر اور ان کی دلکشیوں کو نظر انداز کر کے حق کا راستہ اپناتے ہیں۔قرآن میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جیسے :ایک جانب حسین اور نوجوان یوسفؑ اور دوسری جانب آمادہ و تیار زلیخا اور پھر گھر کے دروازے بھی بند،لیکن یوسفؑ ''مَعَاذَ اللّٰہِ'' کہہ کر اپنا دامن بچاتے ہیں۔(۱)

حضرت ابراہیمؑ سو سال کی عمر میں بیٹے کے آرزومند تھے انہوں نے اس حالت میں خدا کا حکم آتا ہے کہ اے ابراہیمؑ! اپنے اس بیٹے کو ہمارے لیے اپنے ہاتھ سے ذبح کر ڈالو۔حضرت ابراہیمؑ ایک طرف تو بیٹے کی فطری محبت کے دباؤ میں ہیں اور دوسری طرف انہیں خدا کی آواز کا جواب بھی دینا ہے۔وہ ان دونوں باتوں میں سے اپنے فرض کا انتخاب کرتے ہیں اور محبت پدری کے جذبے کو نکیل ڈالتے ہیں۔یہ ہے انسان کا وہ اعلیٰ وارفع مقام جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ دونوں خدا کے حکم کے سامنے جھک گئے،باپ نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے اس کی پیشانی خاک پر رکھ دی۔(۲)

امام علی علیہ السلام اور حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا روزہ کھولتے وقت سخت بھوک کے باوجود اپنا کھانا محتاجوں کو دیکر روزہ پانی سے کھولتے ہیں۔اس دریادلی کے متعلق قرآن کہتا ہے:سخت ضرورت کے باوجود خدا کی محبت میں وہ اپنا کھانا دوسروں کو کھلا دیتے ہیں۔(۳)

یہ خدا کے وہ بندے ہیں جو آدھی رات کو نیند کی کشش کے باوجود اپنے آپ کو بستر سے الگ کر لیتے ہیں اور مناجات اور استغفار کے لیے اُٹھ بیٹھتے ہیں۔اس بارے میں قرآن کہتا ہے: پچھلے پہر وہ اپنے بستروں سے الگ ہوجاتے ہیں۔(۴) اور استغفار میں مشغول رہتے ہیں۔(۵)

---

(۱) سورۂ یوسف،آیت ۲۳ (۲) سورۂ صافات۔آیت ۱۰۳ (۳) سورۂ دہر۔آیت ۸
(۴) سورۂ سجدہ۔آیت ۱۶ (۵) سورۂ ذاریات۔آیت ۱۸

مختصر یہ کہ اللہ کے نزدیک اعمال کی قدر و قیمت کا معیار یہ ہے کہ انسان کو مکمل آزادی حاصل ہو اور پھر وہ تہہ بہ تہہ مادی دلچسپیوں اور فطری رغبتوں کے باوجود راہِ حق کا انتخاب کرے۔

تیسرا جواب: یہ ہے کہ دنیا کی حد بندیوں کے باعث یہاں نیکوں اور گناہگاروں کو سزا جزا ملنا ممکن نہیں ہے۔

مثلاً رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دینے کے لیے جنہوں نے انسانی نسلوں کو صدیوں کی گمراہی، شرک، جہالت اور تفرقے سے نجات دلائی۔آپ کے پاس کون سی جزائے خیر موجود ہے۔

کیا ہمارے پاس شہد اور کباب سے بہتر غذا، ریشم سے بہتر بستر اور ہوئی جہاز سے بہتر سواری ہے؟

کیا یہ غذا، یہ بستر اور یہ سواری، وہی چیزیں نہیں ہیں جن سے کبھی کبھی گنہگار بھی فائدہ اٹھا لیتے ہیں تو پھر پیغمبر اکرمؐ کی جزا کیا ہوئی؟

کیا دنیا میں ایسا کوئی شہید موجود ہے جس نے کسی پاک مقصد کے لئے اس لیے جان دی ہو تا کہ آپ اسے اس کی قربانی کی جزا دے سکیں؟

اس کے علاوہ کبھی کبھی ایسے گناہگار اور مجرم بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو سینکڑوں، ہزاروں بیگناہوں کو قتل کر ڈالتے ہیں۔آپ کسی ایسے فرد کو اس دنیا میں کس طرح قرار واقعی سزا دے سکتے ہیں۔بالفرض ہم اسے موت کی سزا دیں تو یہ ان ہزاروں انسانوں میں سے صرف ایک ہی کے قتل کی سزا ہوگی جنہیں اس نے قتل کیا ہے۔باقی بیگناہوں کے خون کا کیا ہوگا؟

دنیا میں بدلے کی مثالیں

ہماری گفتگو اس بارے میں ہے کہ مکمل سزا دوسری دنیا میں ملنا چاہیے۔یہ سزا ان بعض وقتی سزاؤں اور گوشمالیوں کو مانع نہیں ہے جو بعض افراد کو اس دنیا میں ہی دیدی جاتی ہیں۔بہت سی قرآنی آیات بتاتی ہیں کہ خدا مجرموں کو بعض سزائیں اسی دنیا میں چکھا دیتا ہے۔جیسے قرآن کہتا ہے: لوگوں کے اعمال کے باعث پانی اور خشکی میں اس لیے فساد پیدا ہوا کہ خدا ان کے بعض اعمال

کی سزا انہیں چکھادے ممکن ہے کہ وہ گناہ سے باز رہیں۔(۱)

ایسی بہت سی آتیں ہیں جو مجرموں کے بارے میں کہتی ہیں: گنہگاروں کے لیے دنیا میں بھی ذلت وخواری اور شرمندگی ہے۔(۲) لیکن اصل میں یہ سزا ان کی اس سزا کا ایک ذرا سا حصہ ہے جو انہیں قیامت میں دیکھنا ہوگی۔

اس مقام پر ہمارا قرآن کے کچھ چھوٹے چھوٹے جملے نقل کرنا مناسب رہے گا۔

ان پر دنیاوی زندگی میں بھی عذاب ہے لیکن روزِ قیامت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت ہوگا۔(۳) ایک اور مقام پر یہ فرمانے کے بعد کہ جو کوئی ہماری یاد سے غفلت برتے گا ہم اس پر کڑا وقت ڈالیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ اس کی دنیاوی سزا ہے۔ قیامت کے دن کا عذاب اس سے زیادہ سخت اور ابدی ہوگا۔(۴)

قرآن میں ایک اور مقام پر ہم یہ پڑھتے ہیں: ہم انہیں بڑے عذاب سے پہلے جلد ہی چھوٹے عذاب کا مزا چکھائیں گے تاکہ وہ غلط راہ سے پلٹ آئیں۔(۵)

چوتھا جواب: جو سورۂ نحل سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر خدا انسانوں کو ان کے ظلم اور گناہ کی سزا دے تو کوئی ذی روح زمین پر باقی نہ رہے۔ اس لیے خدا ان کو جلد سزا نہیں دیتا بلکہ انہیں اس وقت تک کے لیے مہلت دیتا ہے جو صرف اسی کو معلوم ہے اور اور سزا کو ملتوی کر دیتا ہے۔(۶)

یہی بات ہم سورۂ فاطر کی آخری آیت میں بھی پڑھتے ہیں: اگر خدا دنیا میں سزا دینا چاہے تو کوئی شخص روئے زمین پر زندہ نہ بچے۔ بنیادی طور پر انسانی زندگی کا نظام درہم برہم ہو جائے اور زمین پر انسان اور اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔(۷)

---

(۱) سورۂ روم۔ آیت ۴۱ (۲) سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۱۴ (۳) سورۂ رعد آیت ۳۴
(۴) سورۂ طٰہٰ آیت ۱۲۷ (۵) سورۂ سجدہ۔ آیت ۲۱ (۶) سورۂ نحل، آیت ۶۱
(۷) سورۂ فاطر۔ آیت ۴۵

پانچواں جواب: اگرچہ دنیا میں وقتی سزائیں دینا انسان کو ہوشیار کرنے، توجہ دلانے اور چونکا دینے کا وسیلہ ہیں لیکن اگر ہر گنہگار اسی دنیا میں اپنی سزا کو پہنچے تو یہ لطفِ خداوندی کی کمی ہوگی کیونکہ ہوسکتا ہے کہ یہ گنہگار بھی توبہ کرلے خدائی احکام کی خلاف ورزی چھوڑ دے۔

ہم نے ایسے کتنے ہی گنہگاروں کو دیکھا ہے یا ان کے متعلق سنا ہے جنہوں نے موت سے پہلے توبہ کرکے اپنا رویہ تک بدل ڈالا۔

چھٹا جواب: سزا و جزا اس وقت عادلانہ ہوگی جب ہم صرف عمل پر ہی دھیان نہ دیں بلکہ اس کے اسباب پر بھی غور کریں۔ بقول قرآن: ''ہم ان کے کاموں کے پہلے کا عمل بھی لکھیں گے اور بعد کے اثرات بھی درج کریں گے۔''(۱)

مثلاً جب کوئی شخص جان لیوا ہیروئن یا کوئی صحت بخش دوا ایجاد کرتا ہے تو ایسے شخص کو فوری پاداش دینا انصاف پر مبنی نہیں ہوگا۔ ہمیں دنیا کی عمر کے اختتام تک انتظار کرکے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کی ہیروئن نے کتنے لوگوں کی جان لی ہے اور اس کی دوا نے کتنے مریضوں کو شفا بخشی ہے۔ اس کے بعد ہم کو اسے بدلہ دینا چاہیے۔

جو شخص کسی رِیت یا نیک کام کی ابتدا کرتا ہے وہ اس کے بدلے میں ان لوگوں کے ساتھ شریک ہوگا جو اس طریق پر چلیں گے یا اس کام کو انجام دیں گے، تاہم اس کی وجہ سے دوسروں کے بدلے میں کمی نہیں آئے گی۔ اس کے برعکس، جو شخص فساد کی جڑ قائم کریگا یا لوگوں کو غلط راہ پر ڈالے گا تو اس راہ پر چلنے والے تو گنہگار ہوں گے ہی ان لوگوں کے برابر کا گناہ اس راہ رِیت کی بنیاد رکھنے والے شخص کے لیے بھی لکھا جائے گا۔(۲)

عدلِ الٰہی کے متعلق آیات

قرآن میں بہت سی آیات ملتی ہیں جو لوگوں کی عقل اور ضمیر سے پوچھتی ہیں کہ کیا اچھے اور برے لوگ برابر ہیں، کیا ان میں کوئی فرق نہیں ہوگا؟

(۱) سورۂ یٰسین۔ آیت ۱۲ (۲) سفینۃ البحار مادہ سن و بحار جلد ۲۔ صفحہ ۳۶۱

کیا وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے ان لوگوں کی طرح ہیں جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ کیا ہم متقی لوگوں کو بدکاروں اور مجرموں کے برابر سمجھیں؟(۱) کیا ہم مسلمانوں کو مجرموں کی مانند سمجھیں؟(۲)

کیا مومن اور فاسق یکساں ہو سکتے ہیں؟(۳)

کیا گنہگار یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کو مومنوں اور ان لوگوں کے برابر مان لیں گے جنہوں نے نیک کام کیے ہیں؟(۴)

تیسرا مرحلہ: دوبارہ زندہ ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں

عام طور پر رکاوٹ چھوٹی طاقتوں کے لیے ہوتی ہے مثلاً ایک گاڑی جو صرف ایک ہی راہ پر چلنے کے لیے مجبور ہے، اس کے لیے اس مجبوری کو دُور کرنے کی کوئی تدبیر بھی نہیں ہے۔ راستے میں پڑا ہوا ایک بڑا سا پتھر اس کی حرکت میں رکاوٹ بن سکتا ہے لیکن یہ پتھر اس پرندے کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں بنتا جو ایک خاص راستے پر چلنے کے لیے مجبور نہیں ہے۔ ہاں طاقت اور علم جتنا ہوگا ان چیزوں کی تعداد جو رکاوٹ بن سکیں اتنی ہی کم ہو جائے گی۔

مُردوں کے زندہ ہونے اور بکھرے ہوئے ذرّات کے اکٹھے ہونے کی دو شرطیں ہیں:

۱۔ لامحدود علم ۲۔ لامحدود طاقت و قدرت

خدا کے اس لامحدود علم کے سامنے جو ذرّے ذرّے کے بارے میں جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے کیا رکاوٹ ہو سکتی ہے۔ ''ہم جانتے ہیں کہ زمین ان میں سے کس قدر مٹا دیتی ہے۔ ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب باتیں محفوظ ہیں۔''(۵) اس کی لامحدود قدرت کے سامنے جو بکھرے ہوئے ذرات کو یکجا کر سکتی ہے کسی رکاوٹ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن نے تقریباً چالیس مرتبہ کہا ہے: ''بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''(۶)

---

(۱) سورۂ ص، آیت ۲۸ (۲) سورۂ قلم، آیت ۳۵ (۳) سورۂ سجدہ۔ آیت ۱۸
(۴) سورۂ جاثیہ، آیت ۲۱ (۵) سورۂ ق۔ آیت ۴ (۶) سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۰

ہم خود مٹی کے بکھرے ہوئے ذرّات سے بنے ہوئے ہیں کیونکہ ہم بھی اس دنیا میں اس گیہوں کی بدولت موجود ہیں جو کسی خاص علاقے کی مٹی میں پیدا ہونیوالا غذائی مواد ہے یا چاول اور پھلوں کی بدولت زندہ ہیں جو ایک اور علاقے کی مٹی سے ترکیب پانے والا غذائی مواد ہے۔ہم ایک عرصے تک باپ کے نطفے کی صورت، پھر ماں کی بچہ دانی میں اور اس کے بعد دنیا میں آئے۔

ہاں اس وقت ہمارے جسم کا ہر خلیہ زمین کے کسی نہ کسی علاقے سے آیا ہے۔جس قدرت نے اس دنیا میں ہمیں بکھرے ہوئے ذرات سے بنایا ہے۔وہی قیامت میں بھی ان گلی سڑی ہڈیوں کے بکھرے ہوئے ذرّات سے ہمیں دوبارہ زندہ کردے گی۔

اصلی مشکل

ہمارے کام کی اصلی مشکل یہ ہے کہ ہم خدا کی قدرت اور علم کو اپنے ہی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔چونکہ ہم خود محدود ہیں اس لیے لامحدود کا تصور نہیں کر سکتے۔قرآنی قصوں میں اوّل سے آخر تک یہ حقیقت نظر آتی ہے کہ خدا ہمارے سوچ بچار کو اس مادّی چوکھٹے کے اثر سے باہر نکالنا چاہتا ہے اس لیے

اگر وہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے مریم نامی ایک کنواری لڑکی کو بچہ عطا فرمایا۔(۱)

اگر وہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے نومولود بچے کو بولنے کی قوت بخشی۔(۲)

اور اگر وہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے ابابیل نامی پرندوں کے ذریعے سے فیل نشینوں کو مروا ڈالا۔(سورۂ فیل۔آیت ۴)

اگر وہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے ایک لاٹھی مار کر پتھروں سے پانی کے بارہ سوتے نکالے۔

(سورۂ بقرہ۔آیت ۶۰)

(۱) سورۂ مریم۔آیت ۲۰ (۲) سورۂ مریم آیت ۳۰

اگر وہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پھونک سے مُردوں کو زندہ کر دیا۔
(سورۂ مائدہ۔ آیت ۱۱۰)

اگر وہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے ایک بوڑھے کو اس کی بانجھ بیوی کے بطن سے یحیٰ نامی بیٹا عطا کیا۔
(سورۂ ہود۔ آیت ۷۲)

اگر وہ کہتا ہے کہ ہم نے خود فرعون کے دامن میں حضرت موسیٰؑ کو تربیت دلوائی۔
(سورہ قصص۔ آیت ۸)

مختصر یہ ہے کہ خدا کے لامحدود علم اور قدرت کے آگے کوئی روک رکاوٹ تسلیم نہیں کی جاسکتی۔

دوسری دلیل: خدا کی حکمت

ہم نے خدائی عدل کو معاد کی پہلی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ اب ہم دوسری دلیل پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اگر قیامت نہ ہو تو خود انسان اور دنیا کی پیدائش ہی فضول، بیکار اور خدا کی دانائی کے خلاف ٹھہرے گی۔

فرض کیجئے کہ ایک شخص طرح طرح کے تازہ تازہ اور مزیدار کھانے اپنے پیارے مہمانوں کی محبت میں خصوصی تجویز کے ساتھ کراتا ہے، پھر یہ کھانے اور مشروبات ایک خوشنما شامیانے کے نیچے، مہمانداری کے ذمہ دار لوگوں کی نگرانی میں سجا دیتا ہے اور مہمانوں کی خاطر بہت سے لوگوں کو نگرانی، انتظام اور حفاظت پر مقرر کر دیتا ہے لیکن ان تمام تکلفات کے بعد، وہ بدتمیز مہمان چوہے بلیوں کی طرح اس دسترخوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور اسے الٹ پلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ دسترخوان سمیٹتا ہے۔ بتایئے اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ ہاں تو اگر معاد نہ ہو تو خدا کا کام اس دعوت اور کھانا کھلانے سے کہیں زیادہ بے مقصد قرار پائیگا۔

خدا نے بھی دنیا کی شکل میں انسانوں کے سامنے ایک دسترخوان بچھا دیا ہے۔ نیا دسترخوان جس کو ایجاد کرنیوالا وہ خود ہے۔[1]

(۱) سورۂ انعام۔ آیت ۱۰۱

یہ بہت اچھا اور خوشنما دسترخوان ہے۔(۱)

ایسا دسترخوان جس پر طرح طرح کی نعمتیں چنی ہوئی ہیں یعنی جو کچھ زمین میں ہے وہ اس نے تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔(۲) وہ بہت سی من بھاتی اور مزے مزے کی چیزیں ہیں یعنی ہم نے پاکیزہ چیزوں کو لوگوں کی روزی بنا دیا ہے۔(۳)

اس دسترخوان کے ساتھ بہت سے کارکن وابستہ ہیں جو اس کے انتظام اور تقسیم کے ذمہ دار ہیں۔ ان فرشتوں کی قسم جو دنیا کے معاملات کی تقسیم کے ذمہ دار ہیں۔(۴) ان فرشتوں کی قسم جو دنیا کے انتظام کے ذمہ دار ہیں۔(۵)

ایک ایسا دسترخوان جس کے ساتھ علاج کے لیے ہمدرد معالج اور گشتی ڈاکٹر ہے

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ رسول اکرمؐ ایسے معالج تھے جو لوگوں کی محبت اور ہمدردی کی وجہ سے خود گشت لگایا کرتے تھے اور روحانی بیماروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کا علاج کیا کرتے تھے۔ واقعی یہ بات تو مانی جاسکتی ہے کہ دانا خدا نے ایک ایسا دسترخوان اس کی تمام خصوصیات اور امتیازات کے ساتھ نسل انسانی کے لیے بچھا دیا ہے لیکن بہت سے لوگوں کو اس کے آداب کا کوئی پاس ولحاظ نہیں ہے۔ ان کا ایک گروہ ظالم ہے، جو ہر طرح سے آرام میں اور آزاد ہے جبکہ دوسرا گروہ قید و بند میں ہے، مفلس اور مظلوم ہے۔ کچھ عرصے کے بعد سب مرجائیں گے اور دسترخوان لپیٹ دیا جائے گا۔ کیا اس صورت میں یہ کام دانائی کا ہے؟

اے خدا! تو نے یہ کائنات بے مقصد اور باطل پیدا نہیں کی(۶) تو ہر قسم کی لغویات اور عیب سے پاک ہے۔

کیا یہ دنیا اس قدر نزاکت، پختگی اور پاکیزگی کے باوجود صرف چند روز کی زندگی اور اس کے بعد ختم ہوجانے کے لیے ہے۔

---

(۱) سورۂ سجدہ۔ آیت ۷ (۲) سورۂ بقرہ۔ آیت ۲۹ (۳) سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۷۰
(۴) سورۂ ذاریات۔ آیت ۴ (۵) سورۂ نازعات۔ آیت ۵ (۶) سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۱۹۱

ایک اور مثال

کیا آپ اس کی اجازت دیں گے کہ ایک افسر بالا کی طرف سے ایک کمرہ بنانے کا حکم صادر ہو جو پانی، بجلی، ٹیلیفون، گرم کرنے اور سرد کرنے کے انتظامات، پردوں، میزوں اور لاؤڈ اسپیکروں وغیرہ سے آراستہ ہو۔

جب وہ کمرہ بن جائے تو اس میں محض ایک دو بار بیٹھنے اٹھنے کے بعد اسے بم سے اڑا دیا جائے۔ پھر ہم اس بات کا کیسے یقین کر لیں کہ جس خدا نے اتنی بڑی کائنات اتنی باریک بینی سے پیدا کی ہو وہ تھوڑے عرصے کے بعد ہی اسے زلزلے اور دھماکے سے برباد کر دے۔

''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بلاوجہ پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف واپس نہیں آؤ گے؟''(۱) کیا اس آسمان، زمین، دریا، سورج، درخت اور جانوروں کا انسان کے لیے ہونا اور انسان کا مرنے اور مٹ جانے کے لیے ہونا درست کام ہے؟

جب یہ طے ہے کہ ہم مرنے کے ساتھ ہی مٹ جائیں گے تو پھر اتنی تکلیف کیوں اٹھائیں۔ واقعی وہ جوانی جو چند دن کے بعد مٹ جانیوالی ہے وہ مہندی لگانے، سنگھار کرنے اور لباس پر نقش بنانے کی سوچے وہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟

اگر ہم موت آتے ہی نابود ہو جائیں گے تو پھر ہماری فطرت میں بقا چاہنے والی جبلت کیوں رکھی گئی ہے؟

میرا خیال ہے کہ ہمیں ''وحی'' سے پوچھنا چاہیے کہ اس نے حکمت الٰہی کی رو سے معاد کا لازم ہونا کس طرح بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن فرماتا ہے: کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ آزاد ہے اور اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔؟(۲) یعنی اس کا خیال ہے کہ وہ مر جائیگا اور اس کے بعد کچھ نہیں ہوگا؟ قرآن میں ایسی بہت سی آیتیں ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ ہم دنیا میں کھیل اور تفریح کے لیے نہیں آئے ہیں۔ نہ ہمارے مقاصد معمولی اور سادہ ہیں، نہ دنیا میں گم ہونا مطلوب ہے بلکہ ہماری پیدائش

(۱) سورۂ مومنون۔ آیت ۱۱۵ (۲) سورۂ قیامت۔ آیت ۳۶

حق کے مطابق انسانوں کی تربیت اور آزمائش کے لیے ہے جو قاعدے اور روش کے ستونوں پر قائم ہے۔ اس تخلیق کا مقصد بہت سے غیر الٰہی راستوں میں سے خدا کے راستے کا انتخاب کرنا، خدا کو پہچاننا اور اس کی عبادت ہے، پس جلد یا بدیر تمہارا یہ راستہ، خدا کے پاس جا کر ختم ہوگا۔ ''ہم خدا ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔''(۱)

موت اور معاد کی یاد کے اثرات

امام صادق علیہ السلام موت اور معاد کی یاد کی اہمیت اور اثر کے متعلق فرماتے ہیں:

۱۔ ذِكْرُ الْمَوْتِ يُمِيتُ الشَّهَوَاتِ ''موت کی یاد خواہشات کو ختم کر دیتی ہے۔''

۲۔ وَيَقْلَعُ مَنَابِتَ الْغَفْلَةِ ''وہ غفلت کی جڑیں اکھاڑ پھینکتی ہے۔''

۳۔ وَيُقَوِّي الْقَلْبَ بِمَوَاعِدِ اللَّهِ ''خدا کے وعدوں کے ساتھ انسان کے دل کو مضبوط کرتی ہے۔''

۴۔ وَيُرِقُّ الطَّبْعَ ''انسانی ذہنیت کو سختی سے نرمی کی طرف لے جاتی ہے۔''

۵۔ وَيَكْسِرُ أَعْلَامَ الْهَوَى ''موت کی یاد ہوا و ہوس کے جھنڈے گرا دیتی ہے۔''

۶۔ وَيُطْفِئُ نَارَ الْحِرْصِ وَيُحَقِّرُ الدُّنْيَا ''حرص کی آگ بجھا دیتی ہے اور دنیا کو انسان کی نظر میں حقیر کر دیتی ہے۔''

اس کے بعد امامؑ فرماتے ہیں: جنابِ رسول اکرمؐ نے جو یہ فرمایا ہے کہ ''گھڑی بھر کی سوچ سال بھر کی عبادت سے افضل ہے۔''(۲) تو اس سوچ کا مطلب اپنے مستقبل، پوچھ گچھ، حساب کتاب، خدائی عدل کی کچہری اور اس میں جواب دہی کے لیے تیاری کے متعلق سوچنا اور انتظام کرنا ہے۔

ہم روایتوں میں پڑھتے ہیں کہ سب سے زیادہ عقلمند اور باہوش وہ لوگ ہیں جو موت کو زیادہ یاد رکھتے ہیں۔(۳)

---

(۱) سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۵۶ (۲) بحار الانوار۔ جلد ۶۔ صفحہ ۱۳۳

(۳) بحار الانوار۔ جلد ۶ صفحہ ۱۳۵

امام علی علیہ السلام ایک حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں: جو موت کو زیادہ یاد کرتا ہے وہ مالِ دنیا کی تھوڑی سی مقدار پر بھی راضی اور مطمئن ہو جاتا ہے اور اس میں زیادہ لالچ اور بخل نہیں ہوتا۔(۱)

یہ امام علی علیہ السلام ہی ہیں جو نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:(۲)

آج یمن و حجاز کے بادشاہ اور ان کی اولاد کہاں ہے؟

ایران و روم کے بادشاہ کہاں ہیں؟

ظالم اور ان کی نسل کہاں چلی گئی؟

کہاں ہیں وہ لوگ جنہوں نے مضبوط قلعے تعمیر کیے اور سونے سے ان کی آرائش کی؟

معاد سے انکار کے محرکات

۱۔ ذمہ داری سے فرار

جب انسان بیابان کے کسی درخت یا زمین سے فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کا ضمیر اور تقویٰ اس سے کہتا ہے کہ ایسا نہ کر کیونکہ اس کے مالک کی رضامندی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ تب وہ اپنے ضمیر کو دھوکا دینے کے لیے کہتا ہے، ان زمینوں اور درختوں کا تو کوئی مالک ہی نہیں ہے۔

۲۔ خدا کی قدرت اور علم پر ایمان کا نہ ہونا

معاد کے مخالفوں اور اس سے انکار کرنے والوں کے پاس اپنی باتوں کی کوئی عملی دلیل نہیں ہے بلکہ وہ صرف دوبارہ زندہ ہونے کو ناممکن سمجھتے ہیں۔

دوسرا بہانہ

معاد کے مخالفوں کا دوسرا بہانہ یہ تھا کہ قیامت کا زمانہ کونسا ہے؟ یعنی قیامت کب آئے گی؟ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ جناب رسول اکرمؐ کے دیے ہوئے جوابات سن کر انہیں مان

(۱) بحار الانوار۔ جلد ۶۔ صفحہ ۱۳۶

(۲) فیض الاسلام صفحہ ۵۹۴۔ خطبہ ۱۸۱

لینے کے بجائے ان لوگوں نے تعجب اور تمسخر میں سر ہلایا اور کہنے لگے: قیامت کا زمانہ کونسا ہے؟[۱] ان لوگوں کو خبر نہیں ہے کہ قیامت آنے کا وقت خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا لیکن وقت اور تاریخ کا نہ جاننا قیامت کا کے انکار کی وجہ نہیں بن سکتا۔ اگر کوئی شخص اپنے مرنے کی گھڑی کا علم نہیں رکھتا تو کیا اسے مرنے ہی سے انکار کر دینا چاہیے؟ ایک اور بہانہ یہ تھا کہ وہ لوگ کہتے تھے: اگر خدا مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے تو تم اس وقت ہمارے باپ داداؤں کو زندہ کر دو۔[۲]

کیا قرآن میں نہیں آیا ہے کہ کچھ لوگ رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں آئے اور کہنے لگے: اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم ایمان لائیں تو اجرامِ فلکی کو زمین پر اتار دیجیے، خدا کو انسانی جسم میں ہمارے سامنے لا کھڑا کیجیے، چاند کے دو ٹکڑے کر دیجیے اور اس پہاڑ میں سے ابھی اور اسی وقت ایک زندہ اونٹ برآمد کر کے دکھائیے۔

یہ لوگ اس بات سے بے خبر ہیں کہ پیغمبروں کا کام قدرتِ الٰہی کی نشانیاں دکھانا اور ان کی دلیلیں پیش کرنا ہے ورنہ یہ دنیا ہر کس و ناکس کی خواہشات کی پابند کوئی نمائش گاہ کا کمرہ یا کوئی صنعتی کارخانہ نہیں ہے۔

کیا چاند کے دو ٹکڑے ہو جانے کے بعد بھی ان لوگوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ جادو ہے؟ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے سب لوگوں سے خدا کی قدرت منوا سکے؟ کیا تیرے میرے ایمان لانے کی خاطر دنیا کا نظام درہم برہم کر کے قدرت کا پہیّا پیچھے کی طرف گھمایا جا سکتا ہے؟ کیا خدا جسم رکھتا ہے کہ وہ تیرے میرے پاس آ کھڑا ہو۔ یہ گفتگو ہم قرآن کی ایک آیت پر ختم کرتے ہیں۔

---

(۱) سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۵۱

(۲) سورۂ جاثیہ۔ آیت ۲۵